R.NO. 2136/57

اکتوبر ۱۹۶۰ء

نگار

قیمت فی کاپی

ہندوستان ۱/۱۲

پاکستان ۷۵ نئے پیسے

سالانہ چندہ (مع مصارف رجسٹری سالنامہ)

ہندوستان دس روپے

پاکستان

تصانیف نیاز فتحپوری

من و یزداں

ہند و مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجمل انسانیت
مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اخوت عامہ کے ایک نئے رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور مذہب کی تحقیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحافت مقدسہ کی تاریخ پر تاریخی و علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے اس کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) صحیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہاروت (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج و ماجوج (۱۸) تاریخ (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ وغیرہ ضخامت ۲۰۲ صفحات۔ کاغذ دبیز قیمت بابجز روپے آٹھ آنے ہے (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں۔ جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت بابجز روپے آٹھ آنے ہے (علاوہ محصول)

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے ہیں۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

مکتوبات نیاز (تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ ان ایڈیشنوں میں پچھلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا اور ۲۸ پونڈ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپے (علاوہ محصول)

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان اس کی انشائے عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

دوست بنانے
اور
دوستی بڑھانے کے لیے
ہمیشہ استعمال کیجیے

گولڈ کوائن
اصلی
ایپل جوس
صاف و شفّاف

بنانے والے

ڈائرمیکن بروریز لمیٹڈ

قائم شدہ ۱۸۵۵ء — ڈیکنرز :- لکھنؤ سولن بروری - لکھنؤ ڈسٹلری - کسولی ڈسٹلری
موہن نگر بروری اینڈ الائیڈ انڈسٹریز (یوپی)

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے

ہماری خصوصیات

کپڑا
سلکی پلین

جورجٹ
بجرگ
کریپ
ساٹن
ٹفاٹہ
بشرٹ کلاتھ
شنٹون
نائلن
نینون

کپڑا
سلکی پرنٹس

فرنچ کوئین
چھوکرہ کوئین
ساٹن فلورنس
گولڈ کریپ
دل بہار
لِنن
شنٹون

کپڑا
اونی

گیبرڈین
سوٹنگ
شال
سرج
پانامہ
پرشیا

ان کے علاوہ عمدہ نفیس سوتی چھینٹ اور اونی دھاگہ۔

تیار کردہ

دی امرتسر رین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹڈ جی۔ٹی روڈ۔ امرتسر

ٹیلی فون 2562 تار کا پتہ: 'رین' (Rayon)

سٹاکسٹ = ٹراونکور رین لمیٹڈ۔ برائے سلکی دھاگا اور مومی (سیلوفین) کاغذ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

۳۹ واں سال | فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء | شمارہ ۱۰

ملاحظات ..... اڈیٹر ۳
کلام اقبال کا سیاسی پس منظر ... پروفیسر محمد لئیسین ۶
تحریک ۱۸۵۷ء کا ایک ماخذ ... خورشید مصطفےٰ رضوی ... ۱۲
ڈال ڈال ۔ پات پات .... برہم ناتھ دت قاصر ... ۲۷
باب الانتقاد ..... سماک رامح ۳۵
صوفی فلاسفہ .... نواب محمد عباس طالب صفوی .. ۳۹
پانی کی دنیا ۴۲
باب الاستفسار ..... لفٹن ۴۴
سرسید کا ایک دلچسپ طنز ۴۷
دوستارے ..... نیاز حسین بی۔ اے ۴۹
منظومات :۔ اکبر حیدری ۔ ارشد کاکوی ۔ سعادت نظیر ۔ جاوید حیدرآبادی ۔ طالب جے پوری ۔ متین نیازی ۔ بدر جمالی ۔ ۵۱
رباعیات ..... شفیق مینائی ۵۳
مطبوعات موصولہ ۵۴

97 سرمایہ کیت
ساکچی جمشید پور

ملاحظات

نہرو۔ ایوب ملاقات

اگست سنہ ۶۰ء کے چند دن (۱۹ اگست سے ۲۲ اگست) ہندوستان اور پاکستان دونوں کی داخلی سیاست کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے تھے، گو دونوں ملکوں کے اتحاد تام کے لئے نہرو اور ایوب مفاہمت کا کوئی مشترک نقطۂ نظر متعین نہیں کر سکے۔

ہندوستان و پاکستان کے درمیان تین باتیں عرصہ سے متنازع فیہ چلی آرہی تھیں۔ ایک بعض مقامات پر سرحدوں کی تعیین ۔ دوسری نہری پانی کی تقسیم اور تیسری سب سے زیادہ اہم ملکیت کشمیر۔ ان میں پہلی بات پر تو مناسب سمجھوتا ہوگیا تھا اور دوسری بات کی مفاہمت کے لئے خود پنڈت نہرو، پاکستان گئے اور عہد نامہ پر دستخط کئے، حالانکہ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ خیال تھا کہ اس سلسلہ میں کشمیر کے متعلق بھی کھل کر گفتگو ہوگی۔ اور غالباً ہوئی۔ لیکن اس وقت تک یہ سب کچھ پردۂ راز میں ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس باب میں پنڈت نہرو اور جنرل ایوب کس نتیجہ پر پہونچے۔

پنڈت نہرو کے پاکستان جانے سے قبل اخباروں سے معلوم ہوا تھا کہ صدر پاکستان کے سامنے مسئلۂ کشمیر حل کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کشمیر کو جموں، وادیٔ سری نگر اور آزاد کشمیر تین حصوں میں تقسیم کر کے ہر جگہ رائے شماری کی جائے، یا پھر یہ کہ نہری پانی

کے فیصلہ کے مطابق جن دریاؤں کے منبع و مخرج سے پاکستان کو پانی ملے گا وہاں پاکستانی افسران کو قیام و انتظام کی اجازت دی جائے۔

ہم کو نہیں معلوم کہ اس خبر کا ردِ عمل یہاں کیا ہوا اور پنڈت نہرو نے اس کو کس نگاہ سے دیکھا۔ تاہم قوی گمان تھا کہ جب پنڈت نہرو پاکستان جائیں گے تو ان کے اور جنرل ایوب خاں کے درمیان اسی اصول کے پیش نظر باہمد گر کوئی نتیجہ خیز گفتگو ضرور ہو گی۔ لیکن جب نہرو، دہلی واپس آئے اور ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے وہاں اس قسم کی گفتگو ہونے سے انکار کیا۔

ہوسکتا ہے کہ اس سے قبل جو کچھ اخبارات میں شایع ہوا تھا وہ صحیح نہ رہا ہو یا یہ کہ اب جنرل ایوب خاں نے اپنی رائے بدلدی ہو۔ بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو، مسئلۂ کشمیر پر کوئی صاف گفتگو نہرو اور ایوب خاں کے درمیان نہیں ہوئی، لیکن آیندہ گفتگو کا دروازہ ضرور کھل گیا ہے اور ہوسکتا ہے کہ آیندہ جب صدر پاکستان، ہندوستان آئیں تو زیادہ واضح خطوط پر تبادلۂ خیال کے مواقع سامنے آجائیں۔

ان مسائل کے علاوہ بعض باتیں اور بھی ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے۔ مثلاً مالیاتی نقطۂ نظر سے درآمد برآمد اور تبادلۂ زر کا مسئلہ یا ثقافتی و انسانی حیثیت سے دونوں ملکوں کے درمیان آنے جانے کی آسانیاں۔ اور مستقبل قریب میں وزارتی سطح پر ان مسایل پر باہم گفتگو کا قوی امکان ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس عہد برق و نور میں بھی کہ مکان و زمان کا مفہوم بالکل بدل گیا ہے، جس وقت دو ملکوں کی باہمی گفتگو و مفاہمت کا سوال سامنے آتا ہے تو زمانہ اپنی جگہ ٹھہر جاتا ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب تک اسی طرح ٹھہرا رہے گا۔ اول تو برسوں اسی سوچ میں گزر جاتے ہیں کہ کچھ کرنا چاہئے یا نہیں اور پھر جب دس سال کے بعد اس کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو دوسری منزل "چہ کنم" کی شروع ہوتی ہے اور اس کے لئے بڑی سی بڑی مدت انتظار بھی کم ہے۔

اس وقت تک تقسیم ہند کو تیرہ سال کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس دوران میں دُنیا کا انسان زمین سے اُڑکر چاند کی ہمسایگی تک پہونچ گیا ہے، لیکن ہندوستان و پاکستان ایک انچ آگے نہیں بڑھے۔ وہی "کنج خمول" اور وہی "فکر فضول"!

اس سے قبل جب فیصلہ تلوار سے ہوتا تھا تو انسان بغیر زحمت انتظار فوراً منزل تک پہونچ جاتا تھا اور اب کہ انحصار عقل و مصلحت پر ہے، فقط انتظار ہی انتظار ہے اور منزل کا دور دور پتہ نہیں۔ اور اگر اسی کا نام جمہوریت ہے تو اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ:۔

اگر این ست گل تازہ کہ من دارم نیست
بلبلاں راز پر و بال گراں تر قفسے!

توقع کی جاتی ہے کہ آیندہ سرما کے اختتام پر جنرل ایوب خاں ہندوستان آئیں گے اور بعض باتیں جن پر کراچی، مری اور لاہور میں کھل کر گفتگو نہیں ہوسکی، دہلی میں زیر بحث آئیں گی، لیکن ہمیں کم امید ہے کہ کشمیر کا مسئلہ پھر بھی طے ہوسکے گا۔

اگر دونوں فریق کچھ ویسے ہی ہوتے جیسے سعدی کے زمانے میں پائے جاتے تھے کہ۔ اگر زنجیر باشد بگسلانند — تو فیصلہ کبھی کا ہو چکتا، لیکن دشواری یہ ہے کہ دونوں بڑے مدبر ہیں، بڑے عقل والے ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ جمہوریت کے پاسبان و نمایندہ ہیں، عوام سے ڈرتے ہیں اور یہی خوف جمہوریت کی کمیڈی بھی ہے اور ٹریجڈی بھی۔

لیکن اگر کشمیر کا مسئلہ فی الحال طے نہیں ہوتا، تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دوسرے مسایل التوا میں ڈال دئے جائیں۔ ان کو طے ہو جانا چاہئے اور جیسا کہ پنڈت نہرو اور صدر ایوب خاں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے ان کا طے کرنا قرار پا گیا ہے۔ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں ملکوں کی آبادی کو ذہنی حیثیت سے ایک دوسرے سے قریب لایا جائے اور یہ کام اخباروں کا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ زیادہ تر سنسنی پیدا کرنے والی خبروں کی فکر میں رہتے ہیں اور یہ کوئی اچھی صحافت نہیں ہے۔

جگر کی موت

ایک دن مرنا سبھی کو ہے، لیکن جب موت انفرادی حیثیت سے ہٹ کر اجتماعی اہمیت اختیار کرلے تو وہ ایک بڑا حادثہ ہوجاتی ہے۔

جگر کی موت بھی ایک ایسا ہی حادثہ ہے۔ یونتو ان کی موت صرف ایک فرد کی موت ہے، لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ وہ کتنے سوگوار اپنے بعد چھوڑ گئے اور کتنی انجمنیں ویران ہوگئیں، تو پھر اس حادثہ کی نوعیت کچھ اور ہوجاتی ہے۔

جگر بڑے اچھے شاعر تھے لیکن اس سے زیادہ اچھے انسان، شاعر ہونے کی حیثیت سے تو کہیں کہیں ان پر نکتہ چینی ہوسکتی ہے، لیکن انسان ہونے کی حیثیت سے ان کے خلاف بہت کم کہا جاسکتا ہے۔ اپنے اخلاق کے لحاظ سے وہ فرشتہ صفت انسان تھے اور آخر کار فرشتوں ہی میں جاکر مل گئے۔

پہونچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مجھے جگر کے مطالعہ کی فرصت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ گو سرسری ملاقات بارہا ہوئی۔ سب سے پہلے یہیں لکھنؤ میں جب وہ مدہوش و سرشار ایک دن دفعتاً مجھ سے ملنے آپہونچے اور اپنی ایک غزل جس کی ردیف "پیارے" تھی، مجھے سنائی، بیخودی بھی تھی اور صدائے "ہل من مزید" بھی، لیکن بات آگے نہیں بڑھی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلے گئے اور میں دیر تک سوچتا رہا کہ کہیں ایسا تو نہیں

عقل ناداں نسبتی دیوانہ تر کردہ مرا

سب سے آخری بار (کئی سال کی بات ہے) جب وہ بھوپال آئے تو میں بھی وہیں تھا، ان کی صحت اس وقت بھی اچھی نہ تھی لیکن وہ اس طرف سے بہت غافل تھے، بڑے لاابالی انسان تھے۔ میں نے ان سے ایک دن کہا کہ پان کا زیادہ استعمال مناسب نہیں اور نہ ساری ساری رات تاش کھیلتے رہنا کوئی معقول بات ہے، لیکن وہ بڑے جذباتی انسان تھے اور ایسا انسان کہنا کم مانتا ہے۔

شاعر ہونے کی حیثیت سے میں ان کی بڑی عزت کرتا تھا، کیونکہ حسرت، فانی، اور اصغر کے بعد غزل گو شعراء میں تنہا انھیں پر نگاہ پڑتی تھی اور اس میں کلام نہیں کہ ان کے اکثر اشعار معیاری ہوتے تھے۔

ان کے یہاں اک خاص والہانہ کیف پائی جاتی تھی، ان کا ایک مخصوص لب و لہجہ تھا، اور ان میں سے کوئی بات مستعار نہ تھی۔

ان کا آخری مجموعہ "آتشِ گل" کے نام سے شایع ہوا ہے جو غالباً ان کے تمام کلام پر مشتمل ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کا انتخاب بھی شایع کیا جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ انتخاب بھی کئی جزو پر مشتمل ہوگا۔

اس وقت تک ان کی یاد میں جو کچھ کہا گیا ہے، اگر اس کا عشر عشیر بھی عملی صورت میں آجائے تو کم نہیں۔

خدا انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے

سالنامہ سنہ ۶۱ء

"غالب نمبر" ہوگا

جس میں غالب کی شوخ نگاری اور اُردو فارسی تغزل کی خصوصیات کو پیش کیا جائے گا، مع انتخاب اُردو فارسی کلام۔

منیجر نگار لکھنؤ

پاکستان کے خریدار

اپنا سالانہ چندہ دس روپیہ ذیل کے پتہ پر ذریعہ منی آرڈر بھیجکر رسید ڈاک خانہ یہاں بھیجدیں

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی

۱۰۵- گارڈن ویسٹ۔ کراچی

کلامِ اقبال کا سیاسی پس منظر

(پروفیسر محمد یٰسین۔ علیگڈھ)

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو، جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

علامہ اقبال کے یہ اشعار زندگی اور ادب کے باہمی رشتہ کے آئینہ دار ہی نہیں بلکہ شعراء و فنکاروں کے جدید مطمح نظر کے مظہر بھی ہیں۔ شاعر اب نہ تو انفرادی خول میں سمٹا ہوا فنکار ہے اور نہ بسم اللہ کی گنبد میں مقید تنہا موسیقار جو اپنے راگ رنگ سے ذاتی سرور کا ساماں مہیا کرے بلکہ وہ حسن و عشق کی داستانوں سے نکل کر سماجی زندگی کی سیاسی، ثقافتی اور معاشی عوامل سے بھی متاثر ہونے لگا ہے۔ یوروپ میں صنعتی انقلاب اور سائنسی ایجادات نے جہاں مذہبی اعتقادات پر ضرب کاری لگائی وہاں شعر و شاعری کے فرسودہ روایات بھی قلع قمع ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لہٰذا انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے سماجی شعور کی جو لہر رومانی شاعری میں داخل ہوگئی تھی اس کا اظہار انگلستان میں میتھو آرنلڈ جیسے شاعر و نقاد کی تحریروں میں بخوبی ہوا ہے۔ آرنلڈ اپنے کو عبوری دور کا انسان تصور کر رہا تھا ..... اس کی ایک دنیا مر چکی تھی مگر دوسری ظہور پذیر نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ جب گوئٹے جیسا شاعر مادیت زدہ یورپ کی اصلاح سے قاصر رہا تو دوسروں سے کیا امید کی جا سکتی تھی؟ ..... شاعری تنقید حیات ہے، شاعر کا فرض محض واقعات و کیفیات قلبی کو مرقوم کرنا ہی نہیں بلکہ زندگی کی تعمیر بھی ہے ..... اس آئیڈیل پر یورپ کا کوئی شاعر پورا نہ اتر سکا اور ہمارا محزون شاعر اسی درد مند آرزو کو لئے ہوئے تہ خاک ہوا۔ کاش شاعر مغرب کی زندگی رفاقت کرتی تو اقبال کی ذات میں وہ اپنا شاہکار شاعر ضرور پا لیتا۔

اقبال نے نطشے کے متعلق کہا تھا ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

بلا مبالغہ آرنلڈ کو اقبال جیسے ژرف نگاہ اور دور بین شاعر ہی کی تلاش تھی۔

اقبال اُردو شاعری میں دیگر حیثیتوں کے علاوہ سیاسی افکار کا بھی پہلا پیغمبر ہے۔ اُردو شاعری جو اب تک کتاب دل کی تفسیر تھی یکایک سرسید اور ان کے رفقائے کار کے ساتھ زندگی کے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے لگی تھی لیکن ابھی تک اس کے راستے متعین نہیں تھے۔ حالی نے "مدِ جزرِ اسلام" لکھی مگر ان کا لہجہ واعظانہ ہو کر رہ گیا جس میں آہ و بکا کو زیادہ دخل تھا اور زندگی کو سود و زیاں سے برتر بنانے کا ولولہ کم۔ اقبال کے کلام کا اگر سیاسی طور پر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بیک وقت ہندوستانی آزادی کا علمبردار، بلاد مشرقیہ کا ترجمان اور بین الاقوامی اخوت کا مبلغ بھی ہے۔

اقبال کی سیاسی شاعری کی ابتدا دراصل پہلی جنگ عظیم کے بعد شدت سے ہوئی ہے۔ جنگ کی خونریزیوں کے بعد وارسائے کی صلح (Treaty of Versailles) نے ایک طرح سے رستے زخم پر محض پٹی باندھی تھی کیونکہ اندر کا زخم ناسور بنتا جا رہا تھا۔ جو انجام کار ہٹلر اور جرمنی کے احیار کا باعث ہوا۔ اسلامی دنیا تو خیر جس انتشار و ہیجان میں مبتلا تھی اس کا

اندازہ مشکل ہے مگر خود فاتحین بھی عجیب کشمکش سے دوچار تھے۔ جنگ عظیم سے یورپ کی ثقافتی و سیاسی زندگی میں جو تعطل پیدا ہو چکا تھا اسے ایلیٹ (Eliot) جیسے شعراء نے یورپین تہذیب کے بانجھ پن (Barrenness) سے تعبیر کیا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جنگ کے بعد دو عظیم ترین ذہنوں نے اپنے تاثرات کا اظہار اپنی معرکۃ الآرا نظموں میں کیا ہے۔ ایلیٹ نے "خرابہ" (The Waste Land) لکھی اور اقبال نے "خضر راہ"۔ دونوں نظمیں بیسویں صدی کی ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایلیٹ، یورپ کے "ٹوٹے اصنام" (Broken Images) کا مرثیہ لکھ کر زندگی کی شیرازہ بندی کے لئے مہاتما بدھ اور رہبانی فلسفہ کی پناہ لیتا ہے، مگر زمانہ جانتا ہے کہ شاعر کا پیغام محبت صدا بصحرا ہو کر رہ گیا اور "شانتی شکی دیوی" صنعتی و مادی یورپ سے روٹھ کر ہمالیہ کی گپھاؤں میں روپوش ہو گئی ..... اقبال کی نظم کی نوعیت مختلف ہے جس میں نہ صرف ایک حساس اور دردمند دل کے تاثرات کا اظہار ہے بلکہ سیاست، معاشیات اور جدید مسایل پر بھی خضر کی زبانی روشنی ڈالی گئی ہے۔ "گوشۂ دل" میں "ایک جہان اضطراب" چھپائے شاعر کی ملاقات خواجہ خضر سے ہوتی ہے اور دوران گفتگو میں شاعر یہ سوال کر بیٹھتا ہے:-

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے — اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش
گرچہ اسکندر رہا محروم آب زندگی — فطرت اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش

خضر شاعر کو جو بصیرت افروز پیغامات دیتے ہیں ——— ان میں واقعات سے فرار یا روگردانی کا شائبہ تک نہیں، زندگی کا مفہوم ان کے نزدیک مستقل جہاد، لگن اور خودی کی تعمیر میں مضمر ہے نہ کہ حکمائے مشرق کی رہبانیت یا عمر خیام کی نشاطیت یا ہارڈی (Hardy) اور ہاؤس مین (Housman) کی قنوطیت میں۔ زندگی درحقیقت ایک قوت نمو ہے جسے فرد "تگاپوئے دمادم" سے تکمیل کو پہونچا سکتا ہے۔ اس کے اندر وہ عنصر ہے جسے برگساں نے " Elan Vital " نے کہا ہے۔ چنانچہ معنویت یا مجہولیت کی بجائے زندگی کی حقیقت "جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں" میں پنہاں ہے۔

پھر شاعر "سمندر" کی طرح "سامان وجود" پیدا کرنے کا قائل ہے کیونکہ اگر "خون صد ہزار انجم" سے سحر طرب آگیں نمودار ہو سکتی ہے تو اس جنگ کی تباہ کاریوں کو ایک تابناک مستقبل کا پیش خیمہ کیوں نہ سمجھا جائے۔ مگر یہ نشاۃ الثانیہ محض انعقاد مجالس اور "گرمیٔ گفتار" سے ممکن نہیں ——— کیونکہ اب بھی طاقتور قومیں اپنی مفاد کے لئے پس ماندہ اقوام کو غلام بنانے کا خواب دیکھ رہی ہیں اور ؎

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

عراق، ترکی، ایران، شام اور عرب ممالک پر انگریزوں اور فرانسیسیوں نے جس طرح تحفظ (Protectorate) کے نام پر سیاسی مکر و فریب کا جال پھیلایا اس سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے۔ اور پھر "نفاق ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی سے کے انکار ممکن ہے:-

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

اگرچہ شاعر کو اس کا بخوبی احساس ہے کہ ایشیائی قوموں کی تہذیب و ثقافت کا نہ صرف جنازہ نکل چکا ہے بلکہ غلامی میں ان کا کردار بھی وہ نہ رہا جو ان کے آباؤ اجداد کا طرۂ امتیاز تھا اور یہ کہ ان کی زندگی اب "جوئے کم آب" ہو کر رہ گئی ہے مگر قنوطیت کی کوئی وجہ نہیں۔

؎ آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا، آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام دودیٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک

"خضر راہ" پہلی مستقل نظم ہے جس میں اقبال کی انسانیت اور تعمیری فکر کا اندازہ ہوسکتا ہے، پروفیسر سرور نے بجا طور پر اسے "عہد نامہ جدید" سے موسوم کیا ہے کیونکہ اس سے پیشتر اگرچہ اقبال کی شاعری تمام بلندیوں کو چھو چکی تھی لیکن یہ ہمہ جہتی بصیرت ان کے یہاں اب تک نہیں پیدا ہوسکی تھی۔ ابتدائی دور کے کلام میں نظمیں زیادہ تر قومی جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں، جن میں "تصویر درد" جیسے شاہکار ہیں یا انگلستان سے واپسی پر "شکوہ و جواب شکوہ" جیسی معرکۃ الآرا مساعی ہیں لیکن ان سب پہ یا تو اقبال علاقائیت (Parochialism) یا حجازیت کے شکار کہے جاسکتے ہیں مگر "خضر راہ" کے متعلق ان کے سخت سے سخت نکتہ چیں بھی اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ "خضر راہ" میں مغربی استعماریت اور ملوکیت پسندی کے خلاف جس غم و غصہ کا اظہار کیا گیا ہے اس کا پس منظر سرزمین ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ اقبال فرنگیوں کی عیارانہ چالوں سے بخوبی واقف تھے لہذا ان کا دل اہل وطن کی باہمی رنجش پر جلتا ہے:۔

؎ جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب۔

اس وطنیت کا اظہار "تصویر درد" میں بڑی شدت کے ساتھ ہوا ہے جس میں شاعر اپنے محبوب ملک کو غیروں کے زیر نگیں پاکر بے حد ملول ہوتا ہے:۔

؎ رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

ولایت جانے پر اقبال کا عقیدہ اور راسخ ہوگیا کہ دُنیا کی مہذب قومیں اپنا وقار اور سیاسی تسلط قایم رکھنے کے لئے ہر ممکن ذرائع اختیار کرسکتی ہیں اور اس سلسلہ میں قتل و خون تک کو روا رکھتی ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء سے لیکر جنگ عظیم اول تک انگریز جو مختلف پینترے بدلتے رہے اور جس طرح اپنی حکومت کو استوار کرتے رہے اس کا اظہار "خضر راہ" میں بخوبی کیا گیا ہے اس لحاظ سے اس نظم کی خاص اہمیت ہے کیونکہ اس کے بعد اقبال کا نظریہ جارحانہ حد تک مغرب دشمنی ہوگیا۔ وہ اب حزب مخالف کے لیڈر تھے جو انگریزی اور مغربی استعماریت کے خلاف اعلان کرچکے تھے۔ چنانچہ "ضرب کلیم" کا ذیلی عنوان "اعلان جنگ دور حاضر کے خلاف" ہے۔

"ضرب کلیم" شاعرانہ بصیرت اور پیغمبرانہ شان کی حامل ہے۔ اس میں سیاسی طور پر اقبال نے دُنیائے اسلام اور عام مسلمانوں کی زبوں حالی کا مرثیہ بھی کہا ہے اور فرنگی سیاست کو بے نقاب بھی کیا ہے۔ دراصل یہ دونوں ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو ہیں ہندوستانی مسلمان بالخصوص، عرصۂ دراز سے "ملاؤں" کے زیر اثر مذہب کی اسپرٹ سے ناآشنا ہوچکے تھے۔ وہ مذہب جو اپنے وطن میں کبھی قیصر و کسریٰ کو لرزہ براندام کرسکتا تھا، آج پردیس میں بقول حالی "غریب الغربا" ہوکر رہ گیا تھا مگر اس کے باوجود قایدین ملت نے ابھی تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں:۔

؎ قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام
؎ ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اس "ملائیت" کے خلاف اقبال نے مستقل جہاد کیا اور اپنے "تشکیل اسلام" میں قدیم مدرسۂ فکر سے

اختلاف کرتے ہوئے جدید روشنی میں اسلام کو پیش کیا ہے۔

مغرب سے متاثر ہونے کے باوجود اقبال کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہاں تہذیب کی کرن اب تک نہیں پہونچ سکی ہے۔ مادی ترقی اور دہریت نے ان کی روح کو کثیف اور دل و دماغ کو پراگندہ کر دیا ہے اور برٹرنڈرسل کے لفظوں میں یورپین قومیں قول و فعل کے تضاد اور نظریہ و عمل کے انتشار سے دوچار ہیں :-

ے ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اقبال کے نزدیک مغرب کے عصبیت زدہ سماج میں مذہب اور سیاست دونوں عیارانہ و شاطرانہ مظاہرے ہیں :-

ے جہانِ مغرب کے بتکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں — ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہیں عقل عیار کی نمائش
ے تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے — یہ وادیِ ایمن نہیں شایانِ تجلی

یا زیادہ واضح لفظوں میں ے

تری حریف ہے یارب سیاست افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

مغربی تہذیب و سیاست پر سب سے زبردست وار اقبال نے مسولینی کی زبان سے کیا ہے۔ جنگ عظیم کی ذمہ داری جس حد تک مغربی سیاست دانوں اور ملوکیت نوازوں کے سر ہے اس سے مسولینی بھی مستثنیٰ نہیں، فرق یہ ہے کہ اس کے مغربی حریف اپنی استعماریت کا جواز تبلیغ عیسائیت میں ڈھونڈھتے ہیں :-

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم — بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں — ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم — تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
آل سیزر جو بدلنے کی آبیاری میں رہے — اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام — تم نے لوٹی کشت دہقاں تمنے لوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

اس مغرب دشمنی کا اثر یہ ہوا کہ اقبال ایک قسم کی کلبیت (Cynicism.) کے شکار ہونے لگے اور انھیں مغرب آزاری کا خبط سا ہو گیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے جمعیت اقوام (League of Nations) تک کو نہیں چھوڑا :-

ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ اور سنبھل جائے

اور "جنیوا" کی جگہ "طہران" کو مرکزی حیثیت دینے کا خواب دیکھنے لگے :-

طہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

ممکن تھا کہ اقبال اپنی کلبیت کے شکار ہو جاتے اگر ایک طرف ایران میں رضا شاہ، ترکی میں مصطفےٰ کمال اور خود ہندوستان میں قائد اعظم انگریزوں کی طلسم سامری کے لئے موسیٰ نہ ثابت ہوتے۔ غالباً اسی امید نے ان کے کلام کی رجائیت برقرار رکھی۔

سیاسی اعتبار سے ۱۹۳۶ء کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" اپنی ڈرامائیت، فنکاری اور فلسفیانہ نقطۂ نظر کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ ابلیس اپنے مشیران کار سے دوران گفتگو میں اپنے کمالات پر نازاں ہے:۔

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب — میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

مگر اس کے رفقائے کار اسے مغربی جمہوریت کی ناکامی اور مومن کی "تیغ بے نیام" کی کند ی پر خوش ہونے سے باز رکھتے ہیں کیونکہ اب لیل و نہار تیزی سے روبہ انقلاب ہیں:۔

میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کو ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس بڑی خود اعتمادی سے اپنی حکومت کی مستقبل کا خاکہ کھینچتا ہے، اسے اگر خوف ہے تو بس شمع محمدی کے پروانوں سے

ہے مرے دست تصرف میں جہانِ رنگ و بو — کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسماں تو بتو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد — یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو،
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک قرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

اسی لئے ابلیس اپنے مشیروں سے انھیں "عالم غنودگی" میں رکھنے پر مصر ہے:۔

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اقبال کے یہ اشعار بلیغ ترین طنزیہ شاعری کے آئینہ دار ہیں۔ ابلیس خوش ہے کہ مسلمان "امامت عالم" سے قاصر ہیں اور جب تک دیگر اقوام کی حکومت دنیا پر جاری و ساری ہے اس وقت تک اس کی اپنی حکومت کو کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ اس نظم میں شاعر کا موڈ کم و بیش "شکوہ" کا ہے مگر نظر میں گہرائی اور فن میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

اقبال کی سیاسی شاعری کی ابتدا اگرچہ وطنی و قومی نظموں سے ہوئی اور اس کی منتہا بین الاقوامی سیاست، اشتراکیت و نسطائیت کے جائزہ تک ـــــ لیکن یہ خیال غلط ہے کہ وہ ہندوستانی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو کلام میں ہندوستان سے ان کا مطمح نظر ذرا بدلا نظر آتا ہے لیکن فارسی کلام میں جذبۂ وطنیت اسی شد و مد کے ساتھ موجود ہے۔ "تصویر درد" کا شاعر پھر سے "اشکے چند بر افتراق ہندیاں" میں اپنی وطن دوستی اور سرزمین ہندوستان سے وابستگی کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ اپنی نظم کا آغاز ہی درد و کرب کے احساس سے کرتا ہے:۔

اے ہمالہ، اے اٹک! اے رودِ گنگ
زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ

وہ برطانوی سیاست اور سامراجیت کے بھوت کو ہندوستان پر مسلط دیکھ کر بیتاب ہو جاتا ہے اور اپنی بے بسی کا ماتم کرتے ہوئے انقلاب کی بشارت دیتا ہے:۔

شرق و غرب آزاد و ایجیر غیر، — خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر

ہند یاں با یک دگر آویختند　　فتنہ ہائے کہنہ با نو انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں　　ثالث آمد در نزاع کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب　　انقلاب! اے انقلاب! اے انقلاب

حق تو یہ ہے کہ اقبال آخری زمانہ تک ہندوستان اور اپنے ہموطنوں کے مسایل سے دوچار رہے، مگر ملک کی بدقسمتی سے باہمی رشک وعناد، فرقہ واریت اور سیاسی گٹ بندیاں ایک صحیح و متوازن قومیت کا تصور نہ دے سکیں۔ اقبال کے تقاریر و بیانات کی روشنی میں بالخصوص ان کے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت (در اجلاس مسلم لیگ) میں یہ نکتہ بجد واضح ہوجاتا ہے کہ ہندوستان میں دو مختلف قوموں، دو مختلف کلچر اور تہذیب کے پیش نظر مفاہمت و مصالحت ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی کی شان میں وہ نظم لکھی :-

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ　　ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است　　چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

اور جس سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے انھیں اپنا وہ مشہور "بیان" شایع کرنا پڑا جو "احسان" میں مولانا کے اعتراضات پر مبنی تھا۔

اردو شاعری میں اگرچہ سیاسی عناصر سرسید کے زمانہ ہی سے شامل ہونے لگے تھے اور حالی، چکبست، سرور وغیرہ کی شاعری میں ایک سوچے سمجھے سیاسی نظریہ کا اظہار ہے، لیکن اقبال سے پہلے کسی نے سیاست کو شاعرانہ رنگ نہیں دیا تھا۔ مولانا حسرت موہانی کی غزلوں کے متعلق ایمائی سیاست کا گمان ہوتا ہے لیکن غزل کی نازک طبیعت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی یہ صحیح ہے کہ اس سیاسی رنگ نے اقبال کی شاعری کو فنی طور پر نقصان پہونچایا کیونکہ "ضرب کلیم" اور اس ضمن کی متعدد نظموں میں وہ وجدانی درک، کیف و سرور، تغزل و غنائیت مفقود ہے جو دور اول سے مخصوص ہے، مگر اس کے باوجود اقبال کے اردو شاعری پر جہاں متعدی احسانات ہیں ان میں یہ بھی شامل ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی کی سیاست پر جو شاعرانہ مواد چھوڑا ہے وہ بڑا قابل قدر سرمایہ ہے۔ اپنے سیاسی کلام کی فلسفیانہ بصیرت کی بدولت اقبال ہندوستانی معاصرین تو کیا مہذب دنیا کے عظیم ترین شعراء کی صف میں نظر آتے ہیں۔ اقوام عالم اور مغربی استعماریت کے متعلق انکی پیشگوئیاں حرف بہ حرف ثابت ہوئیں اور اب یہ کھلی حقیقت ہے کہ اقوام ایشیا "گراں خوابی" سے بیدار ہوچکی ہیں اور جواں عزم قائدین، "یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے منزل مقصود کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بلاد اسلامیہ بھی مغربی استعمار سے آزاد ہوکر نئی شاہراہوں پر گامزن ہیں۔ غالباً اقبال کی یہی وہ دور اندیشی ہے جس نے انھیں

ع　　پیغمبری کرد و پیمبر نہ تواں گفت

کا مصداق ٹھہرایا۔

اگر آپ تاریخی، مذہبی معلومات چاہتے ہیں تو یہ لٹریچر پڑھئے

خدا نمبر = قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ تنقیح اسلام نمبر = قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ فرمانروایان اسلام نمبر = قیمت پانچ روپیہ۔
علوم اسلام و علماء اسلام نمبر = قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ جوبلی نمبر = قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔　　(جملہ عہ۲۵)
یہ پانچوں نمبر ایک ساتھ آپ کو مع محصول بیس روپیہ میں مل سکتے ہیں، بشرطیکہ قیمت آپ پیشگی ذریعہ منی آرڈر بھیج دیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

تحریک ۱۸۵۷ء کا ایک ماخذ

تنقیدی جایزہ

(خورشید مصطفےٰ رضوی)

۱۸۵۷ء کی صد سالہ یادگار کے سلسلہ میں انگریزی میں متعدد کتابیں منظر عام پر آئی ہیں اور ان میں مختلف نظریات اور زاویہ ہائے نظر کے تحت اس تحریک کا جایزہ لیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ بغاوت مورخوں کے درمیان ایک اختلافی مسئلہ بنی رہی ہے اس لئے ان تصانیف میں بھی اس 'مورخانہ نونک جھونک' اور بحث و مباحثے کی چاشنی نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل توجہ آر۔ سی۔ مجمدار کی کتاب "SEPOY MUTINY AND REVOLT OF 1857" ہے جس میں بغاوت کا ایک سرسری جایزہ لے کر بعض نتائج و اثرات سے بحث کرتے ہوئے کچھ نئی باتیں اخذ کی گئی ہیں اور بعض ایسے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں جو تاریخ کی رو سے بے بنیاد ہیں۔

پروفیسر مجمدار پہلے گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے اس موضوع پر تحقیق کرنے کے لئے مقرر کئے گئے تھے لیکن بعض اختلافات کی بنا پر (جس کی تشریح انھوں نے بھی ضروری نہیں سمجھی) علٰحدہ ہو گئے اور اپنی تحقیقات کو کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔ جیسا کہ خود دیباچہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی مفصل تاریخ لکھ رہے ہیں اور یہ اس کا پہلا حصہ ہے انھوں نے یہ بھی اقرار کیا ہے کہ اس کتاب میں بغاوت ۱۸۵۷ء کا تفصیلی جایزہ نہیں لیا گیا صرف خاص خاص واقعات سے بحث کی گئی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ بغاوت کوئی ہنگامی حادثہ نہ تھا اور اس کی جڑیں ماضی میں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

تحریک کی نوعیت کے بارے میں اُن کا نظریہ مبداگانہ ہے، وہ نہ تو اس جدوجہد کے رہنماؤں کو ہیرو ماننے کے لئے طیار ہیں اور نہ اس کو آزادیٔ وطن کی تحریک تسلیم کرتے ہیں۔ نہ انھیں بغاوت کی تہ میں کسی منظم سازش اور طے شدہ پلان کا اقرار ہے، نہ اُس دور کے حیرت انگیز اتحاد کو قابلِ تحسین سمجھتے ہیں۔ انھوں نے باغی رہنماؤں کو اُن کے جذبۂ سرفروشی اور مجاہدانہ عزایم پر خراج تحسین پیش کرنے کی بجائے اُن پر اعتراض کئے ہیں کہ وہ انگریزوں سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے اور بغاوت کے بعد شرائط صلح پر آمادہ ہو گئے وغیرہ۔ لیکن ان الزاموں سے باغی رہنماؤں کے جذبۂ آزادی اور ولولہ انگیز کردار پر حرف نہیں آتا، اور اگر بغاوت سے پہلے انگریزوں سے بہتر تعلقات کردار کی کمزوری کا ثبوت ہیں تو اس الزام سے شاید ہی کوئی بچ سکے کیونکہ نہ صرف رانی جھانسی، نانا صاحب، بہادر شاہ وغیرہ اس زد میں آتے ہیں بلکہ جنرل بخت خاں، خان بہادر خاں، مولانا فضل حق خیرآبادی، شہزادہ عظیم بیگ، دیوان حکمت اللہ، ڈاکٹر نذیر خاں وغیرہ بھی یا تو کمپنی کے ملازمین رہ چکے تھے، یا انگریزوں سے بہتر تعلقات رکھتے تھے لیکن یہ تعلقات نہ تو اُن کے جذبۂ آزادی پر اثر انداز ہو سکے اور نہ مجاہدانہ رزم و پیکار سے انھیں باز رکھ سکے، اس لئے ہم ان رہنماؤں کو صرف اس لئے مطعون نہیں کر سکتے کہ انھوں نے بغاوت سے پہلے انگریزوں سے دوستانہ یا خادمانہ تعلقات رکھے۔ دور کیوں جایئے ۱۹۲۰ء کی تحریک نان کوآپریشن میں یا اس کے بعد کتنے ہی ایسے خطاب یافتہ اور سرکاری ملازمین تھے جنھوں نے اپنے

خطابوں اور عہدوں کو ٹھکرا کر ملک کے گوشے گوشے میں آزادی کی تحریکوں میں حصّہ لیا اور نہ صرف اپنے جسم سے ولایتی کپڑے اُتارے، بلکہ آزادیٔ وطن کی راہ میں اپنی ہر متاعِ عزیز قربان کرتے رہے۔ یہی ایثار پیشہ رہنما آیندہ چل کر ہمارے قومی لیڈر قرار پائے۔ اُن کا سابق کردار چاہے کچھ رہا ہو لیکن وقت آنے پر اُنھوں نے مادرِ وطن کی آواز پر لبیک کہا اور قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دی۔ اِس سے اُن کے کردار کی پستی کا نہیں، عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے پہلے ہی صفحے پر نانا صاحب کا وہ خط دیا گیا ہے جو اُنھوں نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو لکھا جس میں بڑے بڑے قاتلوں کی معافی کے بعد بھی خود نانا صاحب کو بدستور مجرم سمجھنے پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ اگر نانا صاحب کے ان جملوں پر مصنف کو اعتراض ہے تو اِن الفاظ کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو اسی خط کے آخری جملے ہیں:۔

"میں تم سے لڑتا رہا ہوں، اور جب تک زندہ ہوں لڑتا رہوں گا..... تم نے سب کو اپنا حامی بنا لیا اور نیپال کا راجہ تمھارا دوست ہے مگر اس کے باوجود تم کچھ نہ کر سکے..... ہم پھر ملیں گے اور تب میں تمھارا خون بہاؤں گا جو گھٹنوں تک گہرائی میں بہ رہا ہوگا۔ میں مرنے کے لئے طیار ہوں، موت ایک دن ضرور آئے گی، اس سے کیا ڈرنا۔!" (ترجمہ۔ xiii)

نانا صاحب کا ایک اور خط جو اُنھوں نے ۲۵ر اپریل ۱۸۵۹ء کو میجر رچرڈسن کے نام لکھا، ظاہر کرتا ہے کہ وہ انگریزوں سے باعزت صلح کرنا چاہتے تھے۔ خصوصاً اس خط کے یہ آخری جملے ان کے دلیرانہ کردار کو پوری طرح اُجاگر کرنے کے لئے کافی ہیں:۔

"جان یک روز کبھی جائے گی پر اس طرح عزت کھوکر کیوں مرنا اور آپ سے اور ہم سے لڑائی اور فساد و جنگ..... جب تک رہے گا ہم چاہے مارے جائیں چاہے قید ہوں چاہے پھانسی جو لکھا ہوگا سو ہوگا اور ہم سے جو کچھ ہوگا سو تلوار سے ہوگا۔"[1]

لہٰذا نانا کے تعلقات خواہ بغاوت سے قبل انگریزوں کے ساتھ کچھ بھی رہے ہوں، ان کی یہ دلیری، جرأت اور استقلال یقیناً قابلِ قدر ہے۔

شروع میں سراج الدولہ اور جنگ پلاسی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے مگر ان تمام واقعات کے بارے میں بھی مصنف کا نظریہ متعصب انگریزوں کے بیان کردہ واقعات اور "سیر المتاخرین" کا نچوڑ معلوم ہوتا ہے جو انگریزوں کے ایماء سے لکھی گئی تھی۔ مثلاً سراج الدولہ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اس نئے بادشاہ کی ناتجربہ کاری اور دارالسلطنت کے کچھ معزز لوگوں کے ساتھ اس کے پُرغرور اور گستاخانہ برتاؤ نے دربار میں ایک بار پھر سازش کی داغ بیل ڈال دی..... سازشیوں نے برطانوی تجارت پیشہ کمپنی سے مدد چاہی".....

تاریخ کا ایک دیانتدار ادنیٰ طالب علم بھی غالباً یہ بات جانتا ہوگا کہ نیک طینت سراج کے دربار میں سازش کے جال پھیلانے والے اس کے درباری نہیں بلکہ وہ انگریز تاجر تھے جن کی ہوس کاری اور زر پرستی نے جنگ پلاسی کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے بنگال کو مفلس اور کنگال بنا ڈالا۔ یہ سازشیں اس وقت شروع کی گئیں جب سراج الدولہ نے ۱۷۵۶ء میں کلکتہ سے انگریزوں کو شکست دے کر نکال دیا اور کلائیو، مدراس سے اپنے ساتھیوں کو لے کر پہونچا۔ سیٹھ امی چند کا واقعہ اس کا کھلا ثبوت ہے جس کی دولت کو رشوتوں اور نذرانوں میں بہایا گیا اور بعد میں وہ کلائیو کی پُرفریب پالیسی کا شکار بنا۔ جہاں تک سراج الدولہ کے کردار اور پُرغرور

---

[1] یہ اصل خط نیشنل آرکائیوز میں موجود ہے اور ڈاکٹر سین کی کتاب میں بھی اس کا فوٹو بلاک شایع ہوا ہے۔

برتاؤ کا تعلق ہے، اس تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں، یہ تمام واقعات محمد عمر نور الٰہی کی کتاب "سراج الدولہ" (شایع کردہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۴۶ء) میں پوری تفصیل اور مستند تاریخی حوالوں سے دئے گئے ہیں مگر مختصراً علامہ اقبال کا یہ قول یہاں نقل کر دینا کافی ہے کہ :-

"سراج الدولہ کو ابھی ہندوستان نے پہچانا نہیں، ورنہ مرشد آباد دوسرا اجمیر بن جاتا"

(بحوالہ "سراج الدولہ" از محمد عمر نور الٰہی)

علاوہ ازیں سراج الدولہ کی موت پر جو کہرام بپا ہوا وہ عوام میں اس کی ہر دلعزیزی کا کھلا ہوا اور غیر مبہم ثبوت ہے۔ عظیم آباد کا صوبہ دار رام نرائن دیوانوں کی طرح کپڑے پھاڑ کر خاک اُڑاتا پھرتا اور یہ شعر پڑھتا تھا :-

"غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مرگیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزرا"

بیربھوم کے جاگیردار بدیع الزماں نے جنگل کی راہ لی، مرشد آباد میں ناقابلِ بیان گریہ و ماتم بپا تھا۔ کیا "ناتجربہ کار اور گستاخ" سراج الدولہ اسی احترام و عقیدت کا مستحق تھا ؟

جنگ پلاسی کے بعد میر قاسم اور شاہ عالم کے حملے بھی غداریوں اور دغابازیوں کی بدولت ناکام ہوئے، چنانچہ میر قاسم کو اس کے سالار نجف خاں کی غداری نے شکست یاب کیا (بحوالہ تاریخ ہند از ہاشمی فرید آبادی) مگر مصنف نے شکست کے ان اسباب کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ یہ بات تاریخی طور پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ میر قاسم کو کمپنی نے ذاتی جھگڑے[1] پیدا کر کے "تنگ آمد بجنگ آمد" کا مصداق کر دیا تھا اور محصول کے اختلاف نے جنگ کی صورت اس لئے اختیار کی کہ میر قاسم کے اندر غیرت و حمیت کا مادّہ موجود تھا اور وہ انگریز تاجروں کی لوٹ کھسوٹ بند کرنا چاہتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ایسے غیرت مند یا خود دار ہندوستانی حکمراں کو برداشت نہ کر سکتی تھی، کیونکہ وہ اس کے ہاتھوں میں کھلونا بننے سے انکار کر دیتا تھا۔ مصنف نے آگے چل کر خود اِس بات کا اقرار کیا ہے (صفحہ ۲) کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں بلند کردار بادشاہوں کی ہمت افزائی نہ کرتی تھی، اکثر والیانِ ریاست ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتے اور اگر وہ اصلاحات جاری کرنا چاہتے تو انگریز آقاؤں کی ناراضگی کا باعث ہوتا تھا، نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ ملکی انتظامات سے بے خبر ہو کر عیش و عشرت میں غرق ہو جاتے اور

"یہ سب کچھ برطانیہ کی طے شدہ پالیسی کا نتیجہ تھا جس کا اقرار ہاؤس آف کامنز میں انڈر سکریٹری اسٹیٹ فار انڈیا نے کیا جبکہ وہ منی پور کے سیناپتی کی سزا کا اعلان کر رہا تھا، اس نے سیناپتی کی قابلیت، بہتر کردار اور ہر دلعزیزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کبھی نہیں کی ہے"

مصنف نے الحاقِ اودھ کے حالات و واقعات کا کسی قدر تفصیلی جایزہ لیا ہے جہاں کمپنی کی زرکشی نے حالت یہاں تک پہونچا دی تھی کہ شاہی خاندان کے لوگوں کو فاقوں پر نوبت پہونچی، انھوں نے اپنی شالیں اور چھوٹے موٹے زیور تک بیچ دئے۔ ان کی عورتیں رات کی تاریکی میں بھیک مانگنے کو نکلتی تھیں۔

آگے چل کر نواب وزیر علی (نواب اودھ) کی بغاوت کو مصنف نے ملک گیر تسلیم اور ذاتی مفاد سے بلند مانا ہے۔ اس سازش میں سلطان ٹیپو اور دولت راؤ سندھیا بھی شریک تھے اور ان کے درمیان خفیہ عہدنامے اور خط و کتابت بھی ہوئی جس کی

---

[1] مثلاً ملاحظہ ہو "کمپنی کی حکومت" از ہاری

تصدیق وزیر علی کے کاغذات سے ہوتی ہے[1]۔ اس سازش سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک میں اس وقت آزادی کا احساس اور جذبہ موجود تھا۔

کتاب میں انگریزی عہد کی تقریباً تمام بغاوتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے رونما ہوئیں۔ ان میں اکثر عوامی بغاوتیں تھیں اور بعض مختلف جگہوں کے جاگیردار اور راجے نوابوں کی شورش کا نتیجہ تھیں، مثلاً ۱۷۹۲ء میں تیسری جنگ میسور کے معاہدے کی رو سے سلطان ٹیپو کے جو علاقے انگریزی سلطنت میں شامل ہوئے اُن میں مالابار بھی شامل تھا، جہاں چند کے سوا تمام راجہ اور جاگیردار چھ سال تک برابر انگریزوں سے جنگ آزما رہے (صفحہ ۲۶)۔ اس کے علاوہ جن بغاوتوں کا مصنف نے ذکر کیا ہے انکی تفصیل کا یہ موقع نہیں البتہ چند خاص تاریخیں حسب ذیل ہیں :-

۱۸۴۹ء ــــــــــــــــــــ ناگاؤں نے بغاوت کی
۱۸۳۰ء تا ۱۸۳۹ء ــــــــــــــــــــ آسام میں مختلف بغاوتیں
۱۸۰۵ء ، ۱۸۰۳ء ــــــــــــــــــــ بندیلکھنڈ میں مختلف بغاوتیں
۱۸۱۳ء ــــــــــــــــــــ سہارنپور کے گوجروں کی بغاوت
۱۸۳۶ء ــــــــــــــــــــ ساونت وادی
۱۸۴۴ء ــــــــــــــــــــ کولھاپور
۱۸۳۴ء ــــــــــــــــــــ بیجاپور
۱۸۰۱ء ــــــــــــــــــــ ضلع گنجام
۱۸۲۷ء تا ۱۸۲۹ء ــــــــــــــــــــ دکھنی علاقوں میں
۱۸۰۶ء ــــــــــــــــــــ مالابار
۱۸۱۶ء ــــــــــــــــــــ بریلی
۱۸۱۷ء ــــــــــــــــــــ اُڑیسہ
۱۸۴۲ء ــــــــــــــــــــ ساگر
۱۸۰۶ء ــــــــــــــــــــ ویلور

مختلف مقامات مثلاً بیلاری، کڈاپا، اننت پور اور کرنول وغیرہ کی بغاوتوں کے بارے میں مصنف نے باغیوں کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے :-

"اپنے وطن کے دفاع اور آزادی تادیر برقرار رکھنے کے لئے اُن کی اس بہادرانہ اور وطنی جدوجہد کو انگریز مصنفوں نے بھی پرجوش الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا۔"

---

[1] اس سلسلہ میں حسب ذیل انگریزی کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے :-

1. MILL'S HISTORY OF INDIA (IV-126....)
2. S.B.CHAUDHRY- CIVIL DISTURBANCES IN BRITISH RULE.
3. PURNENDU BASU- OUDH AND E.I.CO.
4. FOREIGN DEPTT. SECRET PROCEEDINGS, (1799)

واضح رہے کہ یہاں ان باغیوں اور ان کی جدوجہد کے لئے HEROIC، PATRIOTIC اور LIBERTY جیسے شاندار الفاظ استعمال کئے گئے ہیں مگر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو ان الفاظ سے یاد نہیں کیا گیا اور سب سے زیادہ عجیب بات تو یہ ہے کہ مصنف نے تحریک سید احمد شہید اور اس کے مجاہدین کا نہ صرف یہ کہ ذکر نہیں کیا بلکہ بغاوت میں ان کی خدمات سے بھی صاف طور پر ان الفاظ میں انکار کر دیا ہے :-

"لیکن 'وہابی' بحیثیت مجموعی تحریک سے علٰحدہ رہے ..... وہ ۱۸۵۷-۵۸ء کے انتہائی پُرشور دور میں خاموش رہے - اس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ خالص اسلامی تحریک کے حامی تھے اور انھوں نے ہندوؤں سے اشتراک پسند نہ کیا"

یہ بیان حقیقت اور واقعات سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا۔ مصنف نے یہاں دو صریحی غلط بیانیاں کی ہیں اور بہتر ہے کہ اُن دونوں پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے یعنی :-

(۱) وہابی علماء (تحریک شاہ ولی اللہ یا سید شہید کے متاثرین) بغاوت سے علٰحدہ اور خاموش رہے۔

(۲) وہ ہندوؤں سے تعاون پسند نہیں کرتے تھے۔

اگر صرف سرکاری یادداشتیں اور ریکارڈ دیکھ کر اندازہ کیا جائے تو بھی مبہم طور پر سہی، مگر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان علماء اور خصوصاً تحریک ولی اللہی کے وابستگان کا (جنھیں انگریزوں نے 'وہابی' کے نام سے مشہور کیا ہے) بغاوت میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور رہا ہے - جہاد کی پیہم صدائیں، فرنگیوں کے خلاف مذہبی فتوے اور منظم طے شدہ اسکیمیں ثابت کرتی ہیں کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ایک خاص رنگ بھرا ہے۔ خود جنرل بخت خاں بھی اسی تحریک سے متاثر تھے۔ انھوں نے مولوی سرفراز علی[1] کو امیر المجاہدین مقرر کیا تھا اور ان کے ہمراہ کئی سو مجاہدین تھے۔ اس کے علاوہ دہلی میں مختلف مقامات سے 'مجاہدین' کی جماعتیں آئیں۔ ان کے جذبۂ جہاد کا یہ عالم تھا کہ وہ بھوکوں مرتے، تن پہ کپڑا ثابت نہ تھا مگر انگریزوں سے جنگ آزما ہونے کے لئے روزانہ صبح کو ہتھیار سجا کر نکلتے اور دن چھپے واپس آتے تھے۔ ایک انگریزی جاسوس جیون لال اپنی ڈائری میں لکھتا ہے :-

"میر فیاض علی نے معروضہ پیش کیا کہ جہادی بھوکے مر رہے ہیں، بادشاہ نے جواب دیا کہ انھیں کھلانے کے لئے میرے پاس روپیہ نہیں رہا" (۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء)

ایک شخص نے اپنا تمام ساز و سامان بیچ کر اس راہ میں قربان کیا اور خود بھی برابر جنگ کرتا رہا، ایسی مثالیں موجود ہیں کہ لوگوں نے اپنا زندگی بھر کا پیشہ ترک کر کے جنگ میں شرکت کی جس کو کہ وہ مقدس مذہبی جنگ یا جہاد سمجھتے تھے۔ مختصر یہ کہ ۱۸۵۷ء میں اور اس سے پہلے صرف یہی ایک ایسی جماعت تھی جس کی پشت پر منظم پلان تھا اور جس کی تہ میں قابل ترین دماغ کارفرما تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء میں انگریز یہ معلوم کر کے حیران رہ گئے کہ پنجاب میں یہ 'وہابی' ان کا تختہ اُلٹنے کی فکر کر رہے تھے اور فوجوں سے خط و کتابت کرتے تھے۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک یہ لوگ برابر سرحدی قبیلوں کو انگریزوں کے خلاف اُکسانے کی کوشش کرتے رہے جس کی بدولت حکومت کو سولہ مرتبہ اس علاقے میں جنگ مول لینا پڑی۔ ۱۸۵۷ء میں سرحدی مرکز نے دہلی و لکھنؤ سے رابطہ قایم کر کے انگریزی راج اُلٹ دینے کی اسکیم بنائی تھی، ۱۸۳۸ء میں دو رہنما دکھن گئے اور وہاں مضبوط اور خفیہ تنظیم کی بنیاد ڈالی جو مبارز الدولہ کی سرکردگی میں تھی۔ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں کو اس کا پتہ چل گیا اور مبارز الدولہ

---

[1] مولوی سرفراز علی جونپور کے ساکن، اور مولوی کرامت علی سے بیعت تھے جو ایک مشہور و معروف صوفی منش عالم تھے۔ مولوی سرفراز علی گورکھپور کے قرب و جوار میں لوگوں کو بیعت کرتے اور انگریزوں سے جہاد کی تلقین کرتے تھے۔

کو قید کر دیا گیا۔ اسی طرح سید احمد شہید کی تحریک در اصل انگریزوں کے خلاف تھی مگر چونکہ انھوں نے اپنا مرکز صوبۂ سرحد (ستھانہ) کو بنایا اس لئے پہلے انگریزوں کے حلیف اور حامی رنجیت سنگھ سے جنگ کرنا پڑی[1] چنانچہ بقول جناب تہر:-

"سید صاحب کے نزدیک جہاد کا پہلا ہدف انگریز تھے..... سید صاحب نے جہاد کے لئے جو مرکز تجویز فرمایا تھا اس میں سکھ سب سے پیشتر سامنے آگئے"

اس تحریک نے پورے ملک میں جو تنظیم اور جذبہ پیدا کیا اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہ ملسکے گی تمام بڑے بڑے شہروں میں خفیہ تربیتی مرکزوں کا جال، روپیہ اور آدمی بھیجنے کا حیرت انگیز نظام اور ہزاروں دیندار مسلمانوں میں وہ ولولہ خیز جذبہ جس کا ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے بھی اقرار کیا ہے کہ وہ اپنی ملازمتوں سے اس لئے چھٹی لیا کرتے تھے کہ سرحد جاکر جہاد کریں اور فریضۂ دین سے سبکدوش ہوں۔ پھر، یہ تنظیم اور نظام سید صاحب کے بعد یعنی ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۷ء تک اسی طرح جاری تھا اور بغاوت میں اس تحریک کے تمام مرکزوں نے سرگرمی دکھائی خصوصاً پٹنہ جو ہندوستان میں تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا، انگریزوں کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہوا[2]۔ یہاں مولانا پیر علی جو مذکورہ تحریک کے خاص رہنما تھے انتہائی سرگرمی سے خفیہ طور پر کام کر رہے تھے۔ ان کی ہر دلعزیزی اور اہمیت کو اکثر انگریز مورخوں نے تسلیم کیا ہے، انھوں نے ہی فوجوں میں بغاوت پھیلائی اور کنور سنگھ سے خفیہ خط و کتابت کی[3]۔ ان تمام تفصیلات کے لئے ایک علٰحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔

دوسری بات جس پر روشنی ڈالنا ضروری ہے یہ ہے کہ کیا ان حضرات نے ہندوؤں سے اشتراک و تعاون پسند نہیں کیا؟۔ حالات اور واقعات اس کی بھی تردید کر رہے ہیں۔ اس بات سے تو کسی کو انکار کی گنجائش نہیں کہ یہ تحریک صرف مسلمانوں تک محدود تھی اور اس کا مقصد ان کی اصلاح اور اسلامی جذبہ پیدا کرنا تھا لیکن یہ کہنا کہ وہ ہندوؤں سے اشتراک پسند نہ کرتے تھے صریحی طور پر غلط ہے کیونکہ بغاوت کا سرسری جایزہ لینے پر بے شمار واقعات اس کی تردید کرتے نظر آتے ہیں[4] اور یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مجاہدین ہر جگہ نہ صرف اپنے ملکی بھائیوں کے دوش بہ دوش لڑے بلکہ اکثر جگہوں پر انکی رہنمائی بھی کی ہے۔ اول تو ان 'مجاہدین' یا 'جہادیوں' کا بغاوت میں حصہ ثابت ہو جانے کے بعد اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ غیر مسلموں سے ان کے اشتراک کو واضح کیا جائے، تاہم غلط فہمی دور کرنے کے لئے عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس تحریک کے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سید احمد شہید" از غلام رسول تہر صفحہ ۱۳۱

[2] SYMPOSIUM – 30, HOLMES – 209, KAYE – II – 200.

[3] مولانا پیر علی ہی نے کنور سنگھ کو بغاوت میں حصہ لینے پر آمادہ کیا تھا اور ان کی خط و کتابت پٹنہ لائبریری میں موجود ہے۔ نیز بہار کی سب سے پرانی تاریخ یعنی "تاریخ بہار" از علی محمد شاد (۱۸۷۶ء) میں بھی یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ پیر علی بغاوت کے اصل بانیوں میں تھے۔

[4] ان تمام حالات کی تفصیل کے لئے یہ کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں:-

۱۔ "علمائے ہند کا شاندار ماضی" از مولانا سید محمد میاں ——— ۲۔ "سید احمد شہید"، "جماعت مجاہدین"، "سرگزشت مجاہدین" از تہر

۳۔ "کارنامۂ سروری" از آغا مرزا بیگ ——— ۴۔ "تاریخ عروج عہد انگلشیہ" از ذکاء اللہ

۵۔ "غدر کی صبح شام" مرتبہ حسن نظامی ——— ۶۔ "نقش حیات" از شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی

7. OUR INDIAN MUSLIMS.

8. INDIAN WAR OF INDEPENDENCE – SAVARKAR.

9. NATIVE NARRATIVES –

ایک بانی سید احمد شہید نے خود غیر مسلموں سے اشتراک عمل کی مثال قایم کی ہے، وہ اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالعزیز کے ایماء سے امیر خاں کی فوج میں ملازم ہوئے جو ہلکر کے ہمراہ انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ پھر سید صاحب موصوف نے سرحد کے مرکز جہاد سے دولت راؤ سندھیا کے مدار المہام ہندو راؤ کو خط لکھا اور اُس میں یقین دلایا کہ کامیابی کے بعد اس کی حکومت بدستور رہے گی، بلکہ اور مضبوط۔ سید صاحب کے الفاظ یہ ہیں جو "نقشِ حیات" جلد دوم (صفحہ ۱۳) سے نقل کئے جا رہے ہیں:۔

"بیگانگانِ بیدالوطن ملوک زمین و زماں گردیدہ و تاجران متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ ..... وقتے کہ میدانِ ہندوستان از بیگانگان و دشمنان خالی گردیدہ و نیز سعی ایشاں بہ ہدفِ مراد رسید آئندہ مناسب ریاست و سیاست و طالبین آں مسلم باد و بیخ شوکت و سطوت ایشاں محکم شود"

اس خط سے یہ غلط فہمی پورے طور پر رفع ہو جاتی ہے، لیکن بغاوت کے دوران میں ایسی متعدد نمایاں ہستیاں ملتی ہیں جنھوں نے مشترکہ جد و جہد کی رہنمائی کی ہے۔ مولانا احمد اللہ شاہ یا مولانا فضل حق خیر آبادی کو تو چھوڑئے، کہ وہ اس تحریک سے وابستہ نہ تھے، مگر الہ آباد کے مولوی لیاقت علی جن کو رام چندر نامی باغی سردار نے پوری حمایت و امداد کی، اور ان کی سرد لعزیزی، انتظامی صلاحیت اور تدبر کا لوہا انگریز مورخوں نے بھی مانا ہے[1]۔ علاوہ ازیں حیدر آباد میں مولوی علاؤالدین، مظفر نگر (شاملی) میں، حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت حاجی رشید احمد گنگوہی اور ان کے ہمراہی، کان پور میں مولوی سلامت اللہ (جنھوں نے نانا صاحب کی حمایت کا اعلان کیا)۔ علی گڈھ کے مولانا عبدالجلیل، صوبۂ سرحد میں مولوی ولایت علی وغیرہ وغیرہ، غرض یہ کہ تقریباً ہر علاقے میں یہ لوگ بغاوت کی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔

معین الدین اور جیون لال کی ڈائریاں جن کو منکاف نے "NATIVE NARRATIVES"[2] کے نام سے شایع کیا اور جس کا ترجمہ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے "غدر کی صبح شام" کے نام سے چھاپا تھا، اس میں صرف جیون لال کی ڈائری میں تقریباً پندرہ جگہ "وہابی جہادیوں" کا تذکرہ ہے جن میں دو ہزار تو صرف ٹونک جیسی چھوٹی سی بستی سے دہلی آئے تھے اور اس کے علاوہ ہانسی، حصار، سرسہ، بھوپال، جے پور وغیرہ سے بے شمار جہادی اپنی اپنی مقامی باغی فوجوں کے ہمراہ دہلی میں داخل ہوئے اب اُس دَور کے دہلی سے نکلے والے ایک اخبار یعنی "صادق الاخبار" کی زبانی سنئے:۔

"زبانی خاص آیندہ گوالیار کی مدرک ہوا کہ سات آٹھ ہزار سپاہ کنٹنجنٹ، باقی مجاہدین سب مل کر بارہ ہزار آدمی شاہجہاں آباد کی روانگی پر مستعد ہیں ....." (مورخہ ۳ر اگست ۱۸۵۷ء)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گوالیار سے آنے والے جہادیوں کی تعداد تین ہزار کے قریب تھی۔ اسی اخبار میں اندور کی خبر میں درج ہے کہ:۔

"..... مع جمعیت بارہ ہزار سپاہ کہ ان میں دو ہزار سوار اور آٹھ پلٹن، باقی مجاہدین ہیں وہ شریک ہونے دین کے باتفاق فوج حیدر آباد راہی دہلی ہوں گے"۔ (۳ر اگست)

بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان باغی پلٹنوں میں جن کے ساتھ جہادی دہلی آ رہے تھے ہندو مسلمان سب ہی شامل تھے، بلکہ زیادہ تر ہندو تھے۔

---

[1] مولوی لیاقت علی، حضرت شاہ عبدالعزیز سے بالواسطہ شرف تلمذ رکھتے تھے، انھوں نے جس نظم کو چھپوا کر تقسیم کرایا وہ وہی تھی جو سید صاحب کے زمانہ میں تصنیف ہوئی اور مہر صاحب نے بھی اپنی کتاب میں نقل کی ہے۔

[2] "تاریخ بغاوت ہند" از مکند لال۔

جیون لال ہی کے روزنامچے سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ جہادی برابر باغی فوجوں کے ساتھ انگریزی کیمپ پر حملہ آور ہوتے تھے بلکہ سب سے زیادہ جوش و خروش اور سرگرمی سے جنگ کرتے تھے، مولانا فضل حق خیر آبادی ان واقعات کے چشم دید گواہ ہیں اور انھوں نے یہ حالات انڈمان کے دورانِ قیام میں عربی میں نظم کئے ہیں، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"اب مجاہدین کی ایک مختصر جماعت باقی رہ گئی جو بھوک پیاس برداشت کرکے رات گزارتی اور صبح ہوتے ہی دشمن کے مقابلہ پر ڈٹ کر نبرد آزما ہوتی، لشکریوں کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر یہی شہر پناہ کی حفاظت اور شہری سرحدات کی نگرانی کرتی"[1]

کیا اتنی واضح اور غیر مبہم شہادتوں کے بعد بھی غیر مسلموں سے اشتراک عمل کا ثبوت درکار ہوگا ؟ - مسٹر ہر پرشاد چٹوپادھیا جنھوں نے حال ہی میں بڑی تحقیق اور ریسرچ کے بعد بغاوت پر کتاب (SEPOY MUTINY 1857) لکھی ہے - انہی "وہابی" علماء کے بارے میں ایک اعلان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"یہ اور اس قسم کے دوسرے اعلانات کا جو ہندو مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے تھے، کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا..... وہابیوں کے عقاید اور ان کی رہنمائی نے بھی مسلمانوں کو حکومت برطانیہ کے خلاف کھڑا کر دینے میں بڑا حصہ لیا" (صفحہ ۱۰۳)

مصنف نے بغاوت کی پہلے سے طے شدہ اسکیم اور سازش سے انکار کیا ہے اور اس سلسلہ میں میرٹھ کی بغاوت کو اتفاقی حادثہ قرار دیا ہے حالانکہ میرٹھ کے حالات پر نظر ڈالنے سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہاں سازش کے آثار تھے، وہاں فقیر اور سنیاسی برابر دورے کر کر کے فوجوں کو آمادۂ بغاوت کر رہے تھے، چنانچہ ایک فقیر کا واقعہ سادر کرنے بھی نقل کیا ہے جس کو انگریز افسران نے شبہ گی بنا پر فوجی چھاؤنیوں کے پاس سے ہٹنے کا حکم دیا تھا۔ وہاں علماء بھی دورے کر کر کے بغاوت کے لئے فضا طیار کر رہے تھے چنانچہ ایسے ایک عالم کا تذکرہ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے "بیگمات کے آنسو" میں بھی کیا ہے جو دہلی میں کارتوسوں کی تحقیق کے لئے آئے تھے اور ان کو میرٹھ کے فوجی افسروں نے اس کام کے لئے بھیجا تھا۔ نیز مقدمہ بہادر شاہ کی روداد دیکھنے سے بھی بغاوت کی سازش کا سراغ ملتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ میرٹھ میں یہ شعلہ اچانک اور قبل از وقت بھڑک اٹھا اور انقلابی رہنماؤں کا تمام نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

اکثر انگریز مورخوں نے ہمہ گیر سازش کا وجود تسلیم کیا ہے مثلاً الگزنڈر ڈف نے بغاوت کو سیاسی سازش کا نتیجہ قرار دیا اور عام بغاوت اور انقلاب کہا ہے۔ اسی طرح میلیسن جس نے ان واقعات کی غالباً سب سے زیادہ چھان بین کی ہے، اپنی تیسری جلد میں جو اس نے بغاوت کے چند سال بعد دوبارہ ہندوستان آکر لکھی، یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوا کہ :-

"بغاوت کے کچھ اور بھی اسباب تھے جنھوں نے یہ نفرت کے جذبات ابھارے، جو ذاتی نہیں بلکہ قومی تھے" (۳/۱۱۱)

سرسری طور پر ہی اگر ہم سلطان ٹیپو کے عہد سے ۱۸۵۷ء تک کا جایزہ لیں اور اس دور کی بغاوتوں خصوصاً ویلور کی بغاوت کو بھی پیش نظر رکھیں جو پلاسی کی جنگ سے پچاس سال بعد ہوئی اور بغاوت ۱۸۵۷ء کا ایک عکس یا ریہرسل کہی جا سکتی ہے، تو یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں گے کہ اس آدھی صدی کے دوران میں ملک ایک ہمہ گیر تحریک بغاوت کی طیاری کر رہا تھا اور ملکی حالات آنے والے انقلاب کی گرج سنا رہے تھے۔ گزشتہ صفحات پر ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح ملک کے مختلف حصوں میں برابر بغاوتیں ہوتی رہیں، جن میں کچھ عوامی بغاوتیں تھیں، کچھ فوجی تھیں اور کچھ ستم رسیدہ جاگیرداروں یا نواب راجوں کی شورشیں تھیں۔ لیکن وہ جلد ہی بزورِ شمشیر کچل دی گئیں تو کیا یہ قرینِ قیاس نہیں کہ انھیں منتشر بغاوتوں نے ملک کے ذی ہوش اور صاحب فہم طبقے کو دعوتِ فکر دی ہو؟

---

[1] "الشورۃ الہندیہ معروف بہ باغی ہندوستان" از عبدالشاہد شروانی

کیونکہ ۱۸۵۷ء میں ہم فوجوں کو، عوام کو اور والیانِ ریاست یا جاگیرداروں کو ایک ہی صف میں دیکھتے ہیں، ایک ہی صف میں وہ بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔

خود ڈلہوزی کو اپنی ستم ایجادیوں کا انجام نظر آرہا تھا، جبھی تو اُس نے فروری ۱۸۵۷ء میں کہا کہ:۔

"کوئی سمجھدار شخص جو مشرقی معاملات کا ذرا بھی علم رکھتا ہو جو ہندوستان میں زیادہ عرصہ تک قیام امن کی پیشین گوئی نہیں کرسکتا۔"[1]

چند انگریز مورخ بغاوت کی تہ میں اگر کسی خفیہ تنظیم کا وجود تسلیم کرنے کو طیار نہیں تو بقول مولانا محمد میاں:۔

"ان کو یہ اصرار اس لئے بھی ہے کہ پہلے سے کسی تنظیم کا اعتراف انگریز افسروں کی نااہلیت کا ثبوت بن جاتا تھا، انگریز افسروں کا تکبر اس کو گوارا نہیں کرتا تھا کہ خفیہ تنظیم کا اعتراف کرکے اپنی نااہلیت اور غفلت کو تسلیم کریں۔"

ورنہ متعدد واقعات اِس تنظیم اور سازش کا کھلا ثبوت ہیں، پوری تفصیل کی تو گنجایش ہے، نہ موقع، مگر تمام ملک میں مولویوں، فقیروں اور سنیاسیوں کے دورے، (جس سے انکار کی گنجایش نہیں)۔ بڑے شہروں میں اشتہارات کا چسپاں ہونا، اکثر مقامات پر آگ لگنے کی پُراسرار وارداتیں اور "مجرموں" کا سراغ لگانے میں پولیس اور حکومت کی انتہائی کوشش کے باوجود ناکامی، اکثر مقامات سے خفیہ خط و کتابت کا بروقت پکڑا جانا، مثلاً پٹنہ کے جمعدار پولس وارث علی کی گرفتاری پر ایک خط پکڑا گیا جو وہ گیا کے خفیہ انقلابی لیڈر مولوی علی کریم (زمیندار موضع ڈومری) کے نام لکھ رہے تھے اور اسی خط کی نشاں دہی سے مولوی علی کریم کا پیچھا کیا گیا پٹنہ کے ایک شخص خواجہ حسین علی خاں پر تو ۱۸۴۶ء میں ہی فوجوں کو بغاوت پر اُبھارنے کا الزام تھا۔ چنانچہ مسٹر ہرپرشاد چٹوپادھیا کی تحقیقات کے بموجب:۔

"پٹنہ اور لکھنؤ کے درمیان نامہ و پیام ہو رہا تھا، خفیہ تنظیم کے کارکن فوجوں کو بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے۔ ..... ایک 'وہابی' لیڈر پیر علی کے گھر کی تلاشی لینے پر ہمہ گیر سازش کا انکشاف ہوا ..... پٹنہ کے وہابی مسلمان کچھ عرصہ سے حکومت کے خلاف سازش کر رہے تھے، اس خفیہ تنظیم کے ایجنٹ جگہ جگہ مقرر تھے اور ان کو تنخواہیں دی جاتی تھیں، بغاوت کی طیاری کے لئے چندے کئے جارہے تھے۔"[2] .....

یہ، اور ایسے متعدد واقعات بالکل صاف طور پر سازش اور خفیہ تنظیم کا پتہ دیتے ہیں[3]۔ اور اِن سے انکار کی گنجایش نہیں لیکن حیرت ہے کہ مصنف نے نانا صاحب کو بھی سازش کا رہنما ماننے سے انکار کردیا ہے حتیٰ کہ نانا اور عظیم اللہ خاں کا بھی مختلف مقامات میں دورہ بھی (جو مقدس مقامات کی زیارت کے بہانے بغاوت سے کچھ ہی پہلے کیا گیا) مصنف کے نزدیک کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حالانکہ مقدس مقامات کی زیارت کے لئے ایسے دورے نانا اور عظیم اللہ نے اس سے پہلے بھی اگر کئے ہوتے تو یقیناً اس کی اہمیت نہ رہتی، پھر یہ کہ بغاوت سے دو ماہ پہلے ہی واقع ہونا اور بھی اس خیال کو تقویت پہونچاتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ نانا صاحب خفیہ سازش کرنے جاتے تو علی الاعلان ایسا کرنا کس طرح ممکن تھا؟۔

خفیہ تنظیم اور سازش کے عدم وجود کی ایک دلچسپ ترین دلیل یہ دی گئی ہے کہ نانا صاحب باغی فوجوں کے ہمراہ دہلی نہیں گئے۔ حالانکہ یہ تو ان کی دانشمندی اور دور اندیشی کا ثبوت ہے کہ انھوں نے تمام قوت کو ایک جگہ جمع کرنا اور اس طرح انگریزوں کو مقابلے

---

[1] BRITISH INDIA—R.W. FRASSER-273

[2] SEPOY MUTINY OF 1857—CHATTOPADHYAYA—115, 116, 117.

[3] ان حالات پر تفصیل سے زیر طبع کتاب "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" میں روشنی ڈالی گئی ہے جو ندوۃ المصنفین شائع کرے گا۔

کی آسانی دینا مناسب نہ سمجھا اور اپنی جگہ پر مضبوطی سے قایم رہ کر دشمنانِ وطن سے نبرد آزما ہونے کا ارادہ کیا۔ لیکن اگر یہ دلیل کچھ دیر کو مان بھی لی جائے تو اس کو کیا کہا جائے گا کہ ملک کے دور دراز علاقوں، حتیٰ کہ اندور، گوالیار، بھوپال وغیرہ سے بھی باغی فوجیں مع سرداروں مثلاً بخت خاں، ہمیر آسنگھ، غوث خاں، سدھاری سنگھ وغیرہ کی ہمراہی میں مع جہادیوں اور باغی عوام کے فوراً دہلی کا رخ کرتی ہیں، ہر جگہ بالکل یکساں واقعات پیش آتے ہیں یعنی انگریز افسروں کا قتل، جیل خانوں کا ٹوٹنا، خزانے اور میگزین پر قبضہ۔ زیادہ تر فوجیں اپنے ہمراہ خزانے صحیح و سالم پوری حفاظت کے ساتھ دہلی لاتی ہیں اور شاہی خزانے میں جمع کراتی ہیں۔ پھر دہلی کی شکست کا اثر تمام ملک پر پڑتا ہے، بنگال اور آسام تک کے انقلابی اس شکست سے متاثر ہوتے ہیں (یہ اور بات ہے کہ ہمت نہیں ہارتے) پٹنہ کا جمعدار وارث علی پھانسی پاتے وقت پکار کر کہتا ہے کہ :-

"کوئی ہے جو ہماری موت کی شاہ دہلی کو خبر کردے ——؟"

علی گڑھ اور مدراس وغیرہ سے ایسے سادھو اور برہمن گرفتار ہوتے ہیں جو فوج میں بغاوت پھیلا رہے تھے۔ پھر، لکھنؤ، دہلی میرٹھ وغیرہ میں بھی ایسے فقیروں، مولویوں اور برہمنوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ تو کیا یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ یہ سب لوگ خود بخود بغیر کسی طے شدہ اسکیم اور تحریک کے اس مہم پر نکل پڑے تھے؟۔ اور کیا یہ بغاوت کی تہ میں سازش کا بین ثبوت نہیں ہے؟ جس طرح مختلف باغی رہنماؤں نے اپنے اپنے علاقوں میں رہ کر انتظام حکومت سنبھالا اسی طرح نانا صاحب نے بھی کانپور میں عنانِ حکومت ہاتھ میں لی اور بہادر شاہ کی سلامی دی۔ اس سے سازش کا عدم وجود کہاں ثابت ہوا؟۔ خود ایک شخص سیتا رام کے بیان سے جس کا حوالہ زیرِ نظر کتاب میں بھی دیا گیا ہے، سازش کا وجود ثابت ہوتا ہے مگر مصنف نے اس پورے بیان کی صداقت سے صرف اِس جملے پر کہ۔ "یہ بات ہر شخص خصوصاً ہر برہمن جانتا تھا" یہ کہکر انکار کر دیا کہ :- "یہ بازاری گپ معلوم ہوتی ہے"۔ البتہ سپاہیوں میں کسی خفیہ سازش کا امکان تسلیم کیا ہے، لیکن یہی چیز بتاتی ہے کہ اس کی تہ میں کوئی ماہرانہ اسکیم اور دماغ ضرور کام کر رہے تھے۔

مراد آباد میں بغاوت کی تاریخ یکم جون بتائی گئی ہے جو از روئے تحقیق غلط ہے، یہاں پہلے ۹ر مئی کو بغاوت ہوئی اور جیل خانہ توڑا گیا، لیکن عارضی طور پر حکام نے اس پر قابو پالیا اور دوبارہ ۳ر جون کو یہ شعلہ پھر بھڑکا جس کے بعد انگریز افسران نینی تال کو فرار ہوئے۔ مسٹر چٹوپادھیا نے بھی اپنی کتاب میں ۳ر جون ہی دی ہے۔ کنہیا لال کی کتاب "محاربۂ عظیم" بھی اسی تاریخ کی تصدیق کرتی ہے۔

محاصرۂ لکھنؤ کے دوران میں انگریز محصورین کی بہادری پر اظہارِ حیرت بیکار ہے، واقعات کا غیر جانبدارانہ مشاہدہ صاف بتاتا ہے کہ بہت سے ہندوستانی دورانِ محاصرہ میں انگریزوں کی ہر ممکن مدد کرتے رہے، ان کو ضروریاتِ زندگی بہم پہونچائیں حتیٰ کہ ان کے خطوط مکتوب الیہ تک پہونچائے چنانچہ ایسے ایک شخص انگد نامی کا تذکرہ رٹنر ریز (Rutter Reez) نے اپنے بیان "محاصرۂ لکھنؤ کا چشم دید حال" میں کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ریذیڈنسی میں تمام سامانِ خوراک کے علاوہ میگزین کا ذخیرہ اور بڑی بڑی توپیں موجود تھیں، سکھ سپاہی حفاظت کے لئے تھے جبکہ باغیوں کے پاس لڑائی کے جدید ہتھیار نہ تھے، جب وہ سرنگ لگا کر دیوار میں داخل ہونے کی کوشش کرتے تھے تو سکھ فوجی ان کی تمام کوششیں ناکام بنا دیتے تھے۔

دیانت دار مورخ جب حالات پر اور خصوصاً تاریخی حالات پر قلم اُٹھائے تو اسے قدم قدم پر اپنی دیانتدار اور غیر عصبیت کا احساس کرنا ہوگا لیکن افسوس کہ مصنف کا طرزِ تحریر بعض جگہ ان کی ذہنیت اور رجحان کو آشکار کر رہا ہے۔ کئی مقامات پر اُن کا اندازِ بیان تعصبانہ رنگ لئے ہوئے ہے۔ ایسے پُر آشوب دور میں آپس کے اختلافات کے ہاتھوں کوئی بدامنی پیدا ہوجانا عجیب بات نہیں ہے، چنانچہ ۱۸۵۷ء میں بھی چند اختلافات رونما ہوگئے تھے جن کے پیشِ نظر مصنف نے یہ نظریہ قایم کرلیا کہ "جگہ جگہ

فرقہ وارانہ تنازعات ہوتے رہے" حالانکہ ان کے متعلق یہ وثوق سے بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی نوعیت فرقہ وارانہ بھی تھی یا نہیں کیونکہ بعض مقامات پر ایسا ہوا ہے کہ گوجروں اور جاٹوں نے جمع ہوکر کسی قریبی شہر پر حملہ کیا اور اُس مقام کے باشندوں نے بلا امتیاز مذہب وملت ان کا مقابلہ کیا۔ ایسے واقعات کو دو فرقوں کی "جنگیں" (Communal Riots) نہیں کہا جاسکتا مثلاً مصنف نے مراد آباد میں ایسے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، مگر خاص مراد آباد میں کسی بھی فرقہ وارانہ اختلافات کا تذکرہ نہیں ملتا، البتہ ضلع میں ایک دو جگہ بدنظمی اور انتشار کی وجہ سے ہڑبونگ رہی ہے، مثال کے طور پر امروہہ پر قرب وجوار کے جاٹوں نے حملہ کیا اور اہلِ شہر سے مطالبہ کیا کہ یا تو وہ دس ہزار روپیہ دیں اور یا مہاجنوں کو اُن کے حوالے کریں، چنانچہ اہل شہر نے ان کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور شہر سے باہر مقابلہ کے لئے آئے۔ امروہہ کی ایک قدیم تاریخ "تاریخ اصغری" کے مصنف اپنا چشم دید واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"اپنی جانوں سے ہاتھ دھوکر سب مقابل ہوئے شہر میں بیشمار یہ آدمی رہے اور سب طرف شہر کی حفاظت کو اچھے اچھے مدبر اور کارداں آدمی مقرر ہوئے کس واسطے کہ تمام صحرا گنواروں سے بھرا ہوا تھا اور اس روز کسی طرح غالب ہونے کا گمان نہ تھا۔"[1]

اس عبارت سے کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ جاٹوں کا حملہ کسی فرقہ وارانہ نوعیت کا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اُس دور میں ان اختلافات اور تعصبات کا وجود ہی نہ تھا جیسا کہ آج ہے۔ مگر مصنف نے پورے ملک کے چند چھوٹے موٹے معمولی اختلافات کو تو اُجاگر کیا ہے اور اُن بے شمار واقعات کا تذکرہ بھی نہیں کیا جو ملک کے عدیم المثال اتحاد پر دلالت کرتے ہیں۔ جان ولیم نے تسلیم کیا ہے کہ :-

"ہندو مسلمان ہمارے خلاف پورے طور پر متحد ہوگئے تھے۔"[2]

اسی طرح ایک اور مورخ جوسٹن میکارتھی بڑی خوبی سے لکھتا ہے :-

"اس موقع پر ہم مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف صف آراء نہ کرسکے۔"[3]

بمبئی سے نکلنے والے ایک انگریزی اخبار "پنجابی" کا اقتباس ملاحظہ ہو :-

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ جنگ مذہبی نہیں ہے اور دین دین کے جس نعرے سے ہندوستان کے طول وعرض میں گونج پیدا ہوگئی ہے اس کی تہہ میں تمام باشندگانِ ہند کی یہ کوشش ہے کہ اجنبی اور غیر ملکی محکومی سے آزادی حاصل کریں۔" (۱۱ر جولائی ۱۸۵۷ء)

اسی اخبار کی ۲۷ر جولائی کی اشاعت میں لکھا گیا :-

"اگر مسلمان تیموری خاندان کی حکومت بحال کرنے کے لئے مضطرب ہیں تو یہ امر چنداں حیرت انگیز نہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ہر ذات پات کے ہندو بھی اسی طرف دوڑے جارہے ہیں۔ یقیناً یہ دیکھ کر انسان سراپا تعجب کا پیکر بنجاتا ہے کہ ہندو اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے وقف ہوگئے ہیں۔"

بہادر شاہ کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دربار میں ببانگ دہل کہا ہے کہ ان کی نظر میں ہندو مسلمان دونوں

---

[1] "تاریخ اصغری" ص ۱۸، تفصیل کے لئے تاریخ امروہہ، جلد اول، از محمود احمد عباسی۔

[2] GREAT REBELLION--ASHOK MEHTA--42

[3] "۱۸۵۷ء" از ظہیر۔ ۳۵۸۔

ایک ہیں۔ دورانِ بغاوت میں جب ایک شخص مولوی سعید نے ہندوؤں کے خلاف زہر اگلنا اور آپس میں تفرقہ پیدا کرنا چاہا تو کوئی بھی اسکا ساتھی نہ ہوا، بہادر شاہ نے بھی صاف انکار کر دیا، حالانکہ دہلی جیسی جگہ میں کوئی فساد کھڑا کر دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ علاوہ ازیں خان بہادر خاں، برجیس قدر، نانا صاحب وغیرہ کے اعلانات کی تحریریں، ان تمام رہنماؤں کے ساتھ ہندو مسلمانوں کا متفقہ طور پر کام اور سرفروشانہ جنگ کرنا یہ بتاتا ہے کہ اُس دَور میں فرقہ وارانہ اختلافات اور منافرت کا وجود بھی نہ تھا۔ انگریزوں نے مختلف طریقہ سے کوشش کی کہ مذہبی اختلافات کو ہوا دے کر فایدہ اُٹھائیں اور بدنظمی پیدا کریں مگر وہ پوری طرح ناکام ہوئے، انھوں نے بقرعید کے موقع پر دہلی میں فساد کرانا چاہا اور اپنے ٹٹھو اس مقصد کے لئے چھوڑے لیکن دہلی کی حکومت اور جنرل بخت خاں نے اس قدر سخت پابندیاں لگا کر زبردست انتظامات کئے کہ تمام کوشش بیکار ہوگئی، اسی طرح آگرہ میں جاٹوں اور مرہٹوں کو مسلمانوں کے تقابل کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ بریلی میں کیپٹن گوان کو خصوصی طور پر اس کام کے لئے مامور کیا گیا کہ وہ ہندوؤں کو بھڑکا کر بغاوت پر آمادہ کر دے اور اس مقصد کے لئے پچاس ہزار روپیہ صرف کرے مگر اس نے اپنی پوری رپورٹ میں لکھا کہ "میں اپنی کوششوں میں پوری طرح ناکام ہوا ہوں"[1] انگریزوں کا خیال تھا کہ بریلی میں وہ راجپوتوں اور روہیلوں کو لڑا کر کام نکال سکیں گے مگر انھیں بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ سب سے پہلے جس شخص نے خان بہادر خاں کو اپنا حاکم تسلیم کیا، وہ تھا ایک راجپوت سردار — ٹھاکر جے مل سنگھ —!

ان واقعات کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو ایک پوری کتاب طیار ہو۔ پھر، دہلی، لکھنؤ اور بریلی میں انگریزی اقتدار کا خاتمہ ہونے کے بعد جو انتظامی عدالتیں (Administrative courts) بنائی گئیں اُن میں موجودہ دور کی جمہوریت کی جھلک نظر آتی ہے۔ دہلی ایڈمنسٹریٹو کورٹ کے چند ہندو ممبران یہ تھے :-

جنرل گوری شنکر - صوبیدار میجر جیوا رام - شیورام مصر - بہت رام - بہنی رام -

لکھنؤ کے کورٹ میں حسب ذیل ممبران شامل تھے :-

کیپٹن رگھوناتھ - کیپٹن امداد حسین - داروغہ واجد علی - کیپٹن امراؤ سنگھ اور ممو خاں[2]

منشی جیون لال جو انگریزوں کا جاسوس تھا اپنی ڈائری میں ۷ اگست ۱۸۵۷ء کو لکھتا ہے :-

"حسب ذیل اشخاص نے لال قلعہ کے گارد روم میں آپس میں ملاقات کی :- مرزا مغل بیگ - مرزا خضر سلطان، راجہ دیوی سنگھ - سالک رام مہاجن - رام جی مل داس اور رائے گنجا رام ---- قبل الذکر اشخاص نے باہمی مشورے کے بعد فوج کی تنخواہ کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپیہ جمع کرنے کا وعدہ کیا"

حیرت ہے کہ مصنف نے کہیں اِن واقعات و حقایق کی طرف اشارہ تک نہیں کیا جو اس قدر نمایاں اور واضح ہیں کہ کوئی دیانتدار مورخ مشکل ہی سے نظر انداز کر سکے گا۔

شہزادہ فیروز شاہ کے مراد آباد میں آنے کا ذکر کرتے ہوئے (صفحہ ۲۰) لکھا ہے کہ وہ مراد آباد آیا لوگوں نے رسد اور روپیہ دینے سے انکار کر دیا، فیروز شاہ نے ان کو دبانے کی ناکام کوشش کی مگر وہاں سے ذلیل ہو کر نکلنا پڑا۔ یہ واقعہ حقیقت کے بالکل برعکس ہے کیونکہ شہزادہ جب مراد آباد آیا ہے تو انقلابیوں کی سرگرمیاں پھر تیز ہوگئی تھیں، مراد آباد کے سولہ ہزار افراد نے اس کا ساتھ دینے کی قسم کھائی، نواب رام پور نے جب یہ دیکھا کہ عوام شہزادے کے ساتھ ہیں تو اپنی فوج مقابلہ کے لئے بھیجی مگر اس فوج کے

---

[1] FOREIGN SECRET CONSULATIONS NO 25, S.N. SEN — 352.

[2] SYMPOSIUM — 27.

بھی اکثر لوگ اپنی بندوقیں توڑ کر بھاگ گئے اور بقیہ فوج سے حضرت شاہ بلاقی کے مزار کے متصل مقابلہ ہوا اور نواب کی فوج کو شکست ہوئی۔ امروہہ کی متعینہ فوج نجیب آباد کے باغیوں کے ہمراہ مع توپوں کے شہزادے سے جا ملی تھی[1]۔ جب کرنل جونس کے آنے کی خبر سُنی تو شہزادے نے یہ دیکھ کر اپنی فوج کو بچا لے گیا۔ وہ بغاوت کے اُن رہنماؤں میں سے ایک تھا جنھوں نے مذہب اور وطن کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا اور یہی جذبات اُس کو دیوانہ وار ایک جگہ سے دوسری جگہ لئے پھرتے رہے یہاں تک کہ بغاوت ناکام ہونے کے بعد وہ بیرونی ممالک میں برابر آزادیٔ وطن کے لئے سرگرداں رہا، اس کی خدمات اور کارناموں کا اعتراف ڈاکٹر سین نے بھی کیا ہے مگر افسوس کہ مصنف نے اس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا اور کتاب میں صرف دو موقعوں پر بہت ہی سرسری سا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ بیگم حضرت محل اور بخت خاں کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی ہے جن کے کردار بے داغ ہیں، جنکی جرأت اور مستقل مزاجی ناقابلِ انکار حقیقت ہے اور بغاوت ۱۸۵۷ء میں جن کا کردار اس قدر شاندار اور نمایاں ہے کہ انگریز مورخین بھی خراج تحسین ادا کئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔ غالباً ان حقایق کو اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ یہ مصنف کے نظریات کی تردید ہیں۔ ہاں البتہ دہلی کی بدنظمی اور انتشار کا تذکرہ بہت اہمیت دے کر کیا گیا ہے۔ اِن واقعات کے متعلق مصنف کی صداقت اور حق گوئی "تسلیم"۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں، حکومتوں کے انقلاب اکثر اس قسم کی بے اطمینانیاں اپنے جلو میں لئے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ انگریز پوری طرح متحد تھے اور پختہ عزم و ارادے کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے۔ یہی ان کی کامیابی کی بڑی وجہ ہے۔ مگر باغیوں نے بھی کچھ کم بہادری اور عزم و ہمت کا مظاہرہ نہیں کیا، بقول جناب قہر کوئی شخص پانی بھی اتنی فیاضی سے شاید نہ بہا سکا جتنی فراخ دلی سے انھوں نے خون بہایا ہے۔ اگر ایک طرف غداری اور دغابازی کی شرمناک مثالیں ملتی ہیں تو دوسری طرف عدیم المثال دلیری، وفاداری اور استقلال کی نظیریں بھی تاریخ کے یہی صفحات پیش کرتے ہیں۔ انصاف اور دیانت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ تصویر کا یہ رُخ بھی پیش کیا جاتا اور اگر جنرل نکلسن کو "بہادر نکلسن" کہا گیا تھا تو باغی سرداروں خصوصاً بخت خاں وغیرہ کی فوجی اہلیت و قابلیت کو بھی سراہا جاتا جن کی رہنمائی میں دہلی کے باغیوں نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دئے ہیں اور پھر ۱۴ ستمبر کے بعد شہر کے چپے چپے پر خون کے دریا بہا دئے۔!

یہ غلط خیال ہے کہ بہادر شاہ نے بخت خاں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ حقیقت در اصل یہ ہے کہ ان کو الٰہی بخش نے ایسا کرنے سے روکا تھا جو انگریزوں کی طرف سے اس کام پر مامور تھا اور یہ کام کر کے اس نے فوراً رجب علی کو اطلاع دی۔ اس واقعہ کی تفصیل متعدد کتابوں میں مل سکتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں جگہ جگہ سرسید کی بعض تحریروں کے حوالے اپنے نظریات کی تصدیق کے طور پر پیش کئے گئے ہیں مگر یہ حوالے قابلِ اعتماد اِس لئے نہیں ہیں کہ سرسید انگریزوں کے حامی تھے اور انھوں نے "اسباب بغاوتِ ہند" صرف اس مقصد سے لکھی تھی کہ مسلمانانِ ہند انگریزی ظلم و جبر کا نشانہ نہ بنیں اور بغاوت کے الزام سے بے گناہ ثابت ہو جائیں، چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر انھوں نے بہت سی غلط بیانیاں بھی کی ہیں۔ سب سے بڑی غلط بیانی تو یہی ہے کہ مسلمانوں کو جرم بغاوت سے "بے گناہ" ثابت کرنے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں چپاتیوں کی تقسیم کو وبائی امراض کی نشانی بتایا حالانکہ چپاتیاں خفیہ گروہ کی سازش کا نتیجہ تھیں بہادر شاہ کو مالیخولیا کا مریض کہا وغیرہ۔ ان کا مقصد اسی طرح حل ہو سکتا تھا کہ بغاوت کو غیر منظم ہڑبونگ اور چند سرکش فوجیوں کی شورش بنا کر پیش کیا جائے۔ آگے چل کر مصنف نے (صفحہ ۱۰۰) ایک اور غلط بیانی کی ہے یعنی بی بی گڑھ اور ستی چورا گھاٹ کانپور کے قتلِ عام کے بارے میں، ستی چورا گھاٹ پر انگریزوں کا قتل ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا اس کے لئے نانا صاحب کسی طرح ذمہ دار قرار نہیں دئے جا سکتے[2]۔ خود

---

[1] یہ حالات "اخبار الصنادید" از نجم الغنی اور "تاریخ امروہہ" از محمود احمد عباسی سے ماخوذ ہیں۔

[2] اس واقعہ کی پوری تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں۔ زیر طبع کتاب "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" میں پوری تفصیل موجود ہے۔

انگریز مورخ کے نے بھی ان کو اس قتل عام کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا وہ لکھتا ہے کہ جیسے ہی نانا کو خبر پہونچی انھوں نے حکم دیا کہ انگریز عورتوں اور بچوں کا مزید خون نہ بہایا جائے (جلد دوم صفحہ ۳۴۲)۔ اس سلسلہ میں بہتر ہے کہ ایک چشم دید بیان پیش کر دیا جائے اور یہ ایک فرانسیسی نژاد عورت ہورٹسٹ انگلیسی کی خود نوشت سرگزشت ہے جو خود اس موقعہ پر موقعہ پر موجود تھی اپنی داستان میں کہتی ہے :-

"امید نجات کی دو ایک موجوں سے زیادہ دل میں نہ اٹھی ہوں گی کہ یکایک عین دریا سے آتش بار توپوں کے دغنے کی آواز آنا شروع ہوئی ..... اس درمیان میں نانا راؤ سرداروں کی ایک جماعت کے ساتھ وارد ہوا، اس کے ایک اشارے سے تمام تلواریں نیام میں چلی گئیں اور نانا راؤ ہم سب کو اپنے آگے کر کے مثل قیدیوں کے شہر کی طرف روانہ ہوا ..... اس قتل و غارت کا باعث وہ نہیں تھا ..... اگر فرقہ باغی اس کی اطاعت کر لیتا تو یقیناً یہ قتل و غارت ہرگز نہ ہوتا"[1]

اس سے زیادہ معتبر بیان اس واقعہ کے بارے میں دوسرا نہیں ہو سکتا۔ دوسرا واقعہ بی بی گڑھ کے قتل کا ہے جس کے متعلق اول تو یہ بیان بالکل من گھڑت ہے کہ انگریز قیدیوں کو تکلیفیں دی گئیں، جیسا کہ مصنف نے بھی بعض انگریز مورخوں کی بنیاد پر لکھا ہے۔ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے جس کا اقرار یہ عورت بھی اپنی سرگزشت میں اس طرح کرتی ہے :-

"اس کے (نانا صاحب) حکم سے ہم لوگوں کو انگریز سردار کے مکان میں جگہ دی گئی جہاں ہماری آسایش کا کافی سامان مہیا تھا لیکن ساتھ ہی اس کے یہ حکم بھی تھا کہ اس مکان سے کہیں باہر نکل کر نہ جائیں ..... تقریباً پندرہ روز ہم اس کی حمایت میں رہے ہوں گے اس درمیان میں کسی قسم کی تکلیف ہم کو نہیں ہوئی، بہت آرام سے زندگی بسر کی"[2]

لیکن اس تمام آسایش کے باوجود انگریز عورتیں اپنی حرکتوں سے باز نہ رہ سکیں اور باہر کے لوگوں سے نامہ و پیام شروع کر دیا خطوط پتھروں میں باندھ کر پھینکے جاتے اور وہ لوگ ان خطوں کو انگریزی فوج تک پہونچا دیتے تھے۔ اس حرکت پر نانا صاحب اور اہل کانپور کا غصہ بیجا نہ تھا کیونکہ انگریزی فوج غالباً انہی خطوط کی مدد سے کانپور سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی، لیکن نانا صاحب کی انصاف پسندی کی داد دینی پڑے گی اور یہ فرانسیسی عورت خود اعتراف کرتے ہوئے کہتی ہے کہ :-

"اسی درمیان میں چند لوگ نانا راؤ کے ہمارے مکان میں آئے اور ان چار عورتوں کو گرفتار کر کے لے گئے جنھوں نے لوگوں سے خط و کتابت کی تھی اور باہر نکلتے ہی قتل کر ڈالا"[3]

یعنی صرف انہی عورتوں کو قتل کرایا گیا جو مبالغت کے باوجود احاطے میں جانے اور خط و کتابت کرنے کی مرتکب ہوئیں۔ لیکن اسکے بعد شہری عوام کا مشتعل ہجوم اندر گھس آیا اور بقیہ عورتوں کا بھی قتل عام کر دیا، جو واحد زندہ عورت اس قتل عام سے بچی وہ یہی فرانسیسی نژاد عورت تھی۔

اودھ کے تعلقہ داروں نے جو دلیرانہ کردار پیش کیا وہ یقیناً کسی عظیم مقصد کے شایان شان ہے، ان کے بارے میں یہ رائے درست نہیں کہ وہ مارچ ۱۸۵۸ء کے بعد میدان میں آئے اور اس ثبوت میں لارڈ کیننگ کا وہ خط پیش کیا جا سکتا ہے جو اس نے

---

[1] "ایام غدر" — ۱۷۰

[2] "ایام غدر" — ۱۷۱ - ۱۷۰

[3] ۲۰ مارچ ۱۸۵۸ء کو لارڈ کیننگ کا اعلان شایع ہوا جس کی رو سے باغی تعلقہ داروں کی جائداد ضبط قرار دی گئی۔

اوٹرام کو لکھا۔ وہ لکھتا ہے :۔

"شاید آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اودھ کے جاگیرداروں اور زمینداروں نے اس لئے بغاوت کی ہے کہ ان کو ہمارے مقرر کردہ محصول کی بدولت ذاتی نقصانات پہونچے، لیکن گورنر جنرل کی رائے میں یہ چیز کچھ اور قابلِ غور ہے ..... یہ اور ایسی دوسری مثالیں بالکل صاف طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ ان زمینداروں اور راجوں کی ہمارے خلاف بغاوت کا سبب صرف ان کا ذاتی نقصان ہی نہیں ہے جو ہماری حکومت کے سبب پہونچا۔"[۱۵]

اگر بہت سے ہندوستانیوں کا انگریزوں کی حمایت میں لڑنا اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ بغاوت عام اور قومی بنیادوں پر نہ تھی، جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے، تو مستقبل میں جو تحریکیں چلیں یعنی ۱۹۲۰ء یا ۳۰ء میں یا ۴۲ء میں، ان کو بھی اسی دلیل کی رو سے قومیت سے خارج کرنا چاہئے اور نہ وہ آزادی کی تحریکیں کہی جانے کی مستحق ہو سکتی ہیں۔ کیا محترم مصنف یہ ماننے پر طیار ہوں گے؟

حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک ہماری جدوجہد آزادی کی پہلی کڑی تھی جس میں ملک کے ہر طبقے، ہر فرقے اور ہر ذات کی نمایندگی نظر آتی ہے، پہلی اور آخری بار تحریک ۱۸۵۷ء نے ملک کے مختلف الخیال، مختلف مذہب، مختلف عقیدہ اور مختلف زبان رکھنے والوں کو متحد کر دیا اور ناکام ہو جانے کے باوجود بھی غیور فرزندانِ وطن کے دلوں میں احساسِ غلامی کو جاودانی بخشی، ان کو حوصلہ اور ہمت عطا کی جس کے سہارے اس تاریک و دشوار راہ میں ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہو سکی۔ چنانچہ آنے والی تحریکوں پر بغاوت ۱۸۵۷ء کی یاد نے زبردست اثر ڈالا جس کا اقرار نہ صرف سین کو ہے بلکہ خود محترم مصنف نے بھی زیرِ نظر کتاب کے آخری صفحہ پر یہ مانا ہے کہ بغاوت کی یاد نے برطانوی سامراج کی جڑیں اکھاڑنے میں بڑی مدد کی۔

نیا ادبی لٹریچر

مینجر "نگار" لکھنؤ

(چوتھائی قیمت پیشگی آنا ضروری ہے)

ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	سید احتشام حسین	۱	۸
ساحل اور سمندر (سفرنامہ)	" "	للعہ	۸
چھان بین۔ تنقیدی مقالات	اثر لکھنوی	۲	۸
گلدستۂ محسن، یعنی صبحِ تجلی، چراغِ کعبہ	محسن کاکوروی	۱	۱۲
تنقیدی مطالعے	اویس احمد ادیب	۲	۸
تعبیر۔ تشریح۔ تنقید	پروفیسر مسیح الزماں	۱	۸
اردو ادب میں رومانوی تحریک	ڈاکٹر محمد حسن	۱	۸
حرفِ تمنا۔ مجموعۂ کلام	میکش اکبر آبادی	۲	۸
آتشِ گل	جگر مراد آبادی	۲	۸
ناول کی تاریخ اور تنقید	علی عباس حسینی	۲	۸
ناول کیا ہے؟	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	۲	۸
اردو عربی ڈکشنری	عبدالحفیظ بلیاوی	۲	۸
شعر و ادب۔ تنقیدی مقالات	سید اختر علی تلہری	۲	۸
تنقیدی شعور	" "	۱	۱۲
اردو ڈراما اور اسٹیج	پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب	۲	۸
آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ	" "	۱	۸
رزم نامۂ انیس	" "	۲	۸
روحِ انیس	" "	للعہ	۸
تذکرۂ نادر۔ مصنفہ کلب حسین نادر شاگرد ناسخ۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب		۱	۸
فسانۂ عبرت۔ مصنفہ رجب علی بیگ سرور	" "	۱	۸
فرہنگ امثال	" "	۱	۸
بیگمات اودھ	تصدق حسین	۲	۸

ڈال ڈال — پات پات

(برہم ناتھ دت قاصر)

مجموعہ ہے جناب برہم ناتھ دت صاحب قاصر کے غیر مطبوعہ خطوط کا جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لکھے تھے۔

جناب قاصر، پنجاب کے ایک مردم خیز قصبہ "دیرم دُمان" کے ایک علم دوست خاندان میں پیدا ہوئے (۱۸۹۰ء) اور یہیں آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس منزل سے گزرنے کے بعد زراعت کی طرف (جو ایک خاندانی مشغلہ تھا) آپ کو توجہ نہ ہوئی اور دہلی کے ایک تجارتی ادارہ سے وابستہ ہوگئے۔ چند سال بعد آپ کا تبادلہ امرتسر ہوگیا اور ۱۹۱۳ء سے لے کر اس وقت تک یہیں مقیم ہیں۔ اس شعبہ میں آپ نے جتنی ترقی کی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ دُنیا کے اکثر بڑے بڑے تجارتی اداروں کی نمایندگی آپ نے کی اور اب تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

جب ۱۹۱۲ء میں آپ دہلی سے امرتسر آئے تو جناب فیروزالدین طغرائی کی شاگردی اختیار کی۔ گو شعر کہنے کا چکا آپ میں اوایل عمری سے پایا جاتا تھا۔ لیکن جناب طغرائی کے زیر اثر یہ ذوق زیادہ رچ گیا یہاں تک کہ ملک کے مشہور اخبارات و جرائد (مثلاً زمیندار۔ بندے ماترم۔ ہندوستان وغیرہ) میں آپ کا کلام شایع ہونے لگا۔

آپ بڑے وسیع المطالعہ انسان ہیں۔ اُردو و فارسی شعراء کے علاوہ کالیداس، ہومر، ورجل، شیکسپیر، دانٹے، گوئٹے وغیرہ کا بھی آپ نے گہرا مطالعہ کیا ہے اور تاریخ مذاہب پر بھی آپ کو بڑا عبور حاصل ہے۔ لیکن سب سے زیادہ آپ کو جس چیز نے متاثر کیا وہ تصوف و فلسفہ کا مطالعہ تھا، اسی نے آپ کو بتایا کہ اصل مذہب انسانیت پرستی ہے اور بہیئت اجتماعی نام ہے صرف خلوص و محبت کا۔

یہ ارتقاء انسانی کی بڑی بلند منزل ہے اور اس تک پہونچنے کے لئے انسان کو بڑی قربانیاں کرنا پڑتی ہیں، چنانچہ ہمارے قاصر صاحب کو بھی بارہا یہ خراج ادا کرنا پڑا یہاں تک کہ ایک بار امرتسر میں آپ کا گھر، آپ کا کتب خانہ اور آپ کا سب کچھ اس لئے نذر آتش کر دیا گیا کہ آپ کو "مسلم نواز" سمجھا جاتا تھا۔ کون تھا جو اس مشرب کو سمجھ سکتا کہ :-

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود

جناب قاصر کے مکاتیب کا مجموعہ دراصل ان کی انسانیت پرستی اور وسعت نظر کی بڑی لطیف و دلچسپ داستان ہے۔ اس کے چند ٹکڑے آپ بھی سُن لیجئے۔

(نیاز)

امرت سر ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۸ء

بخدمت ڈاکٹر سنت رام صاحب سیٹھ ۔ سابق ایم ۔ ایل ۔ اے ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ امرت سر

محترم ۔ تسلیم ..... کا جلوس بہت شاندار تھا، جے جے کے فلک بوس نعروں کے درمیان پھولوں سے لدی پھدی موٹر

سست روی میں چیونٹی کو بھی مات دے رہی تھی، لوگوں نے جی بھر کر درشن کئے، پھول برسائے ہماری ذیشان قوم کا کوئی کام بغیر سیم وزر کی نمائش کے کامیاب تصور نہیں کیا جاتا، اس لئے صاحب جلوس پر نوٹ اچھالے گئے، گلے میں نوٹوں کے ہار ڈالے گئے، جو اپنی عظمت کے گھمنڈ میں، پھولوں کی تروتازگی و عطر بیزی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے، اور اُن سے دست و گریباں ہو رہے تھے، پھولوں کی یہ بے حرمتی دیکھ کر صاحب جلوس کی بدمزاقی پر رونا آیا، خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا!

صاحب جلوس کا چہرہ تابناک تھا، آسودگی، خوش حالی، اطمینان اور ہیجان کے زیر اثر گاہے اُٹھتے گاہے بیٹھتے، غرض جلوس ہمارے پاس سے بصد شان و شوکت گزر گیا!

دوسرے دن سنا کہ صاحب جلوس گرفتار کر لئے گئے، تصادم میں تین سپاہی اور تین تماشائی اس جھگڑے میں کام آئے، خیال کیا کہ اہل جلوس ہمارے نہیں بلکہ کسی دشمن ملک کے باشندے ہوں گے، جو ہمارے ملک میں گھس کر، ہمارے سپاہیوں کو تہ تیغ کر گئے، جب پتہ چلا کہ اس فساد کے بانی ہمارے ہی ملک کے باسی تھے، اور بنائے فساد یہ تھی کہ علم کا دائرہ محدود رہے، اور ہماری اپنی مادری زبان اُردو، درس و تدریس میں خارج از وطن ہو جائے، تو اس کم مائگی پر مجھے پہلے سے بھی زیادہ رونا آیا، کئی دن اپنے ماں باپ کی یاد میں روتا رہا، کیونکہ یہ بولی، انھوں ہی نے اپنی املاک کے ساتھ مجھ کو ورثہ میں دی تھی

میں نے صاحب جلوس کے متعلق مزید واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی، تو معلوم ہوا کہ صاحب علم و فضل ہیں، بی۔ اے ہیں، فصیح البیان مقرر ہیں، اپنے آپ کو شیر پنجاب کہتے ہیں، اور موجودہ حکومت کو پلٹنے کے درپے ہیں، میں نے پوچھا، پھر یہ انگریز کی حکومت کے تو سخت مخالف رہے ہوں گے، معلوم ہوا "نہیں"۔

جب آزادی کے پروانوں اور دار و رسن کے شیدائیوں کا پرشکوہ جلوس پورے وقار اور شان کے ساتھ اپنی منزل کی طرف تیزی سے گامزن تھا اور جب زندہ دلان پنجاب زنداں میں بند تھے، تو یہ صاحب روباہ صفت پیچھے دبکے پڑے تھے، یہ جان کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا، اور اپنے چہرے کو ندامت کے دامن میں چھپا لیا، خدایا! میرے وطن کا کیا ہوگا، جب خود اہل وطن ہی اپنی مادری زبان اور اپنی حکومت کی بیخ کنی کے درپے ہیں۔

میرے بھائی! میرے پیارے! اے وطن کے شیدائی! اس ماتم میں میرا شریک حال بن

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

اپنے دیس کا پنجابی شاعر سید فضل شاہ یاد آگیا، کیا بات کہہ گیا ہے:-

اوسے دکھ نوں وڈھناں لوڑ یوئی جس دکھ دے ہیٹھ آرام کیتو

احقر - برہم ناتھ دت

بیٹے کے نام

امرتسر - ۲۳ جنوری ۱۹۲۶ء

برخوردار!

زندگی میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ آدمی ثابت قدم ہو، جرأت مند ہو، مستقل مزاج ہو، محنت و مشقت سے دل نہ چرائے، بردباری اور صبوری سے کام لے، اور اپنی ناکامیوں سے مایوس نہ ہو جائے۔

زندگی کی تگ و دو میں ناکامیاں بار بار راستہ روک لیتی ہیں مگر یاد رکھو، شکستیں ہی ترقی کا پیش خیمہ ہوتی چلی آئی ہیں، غلطیاں ہی

اصلاح کی طرف راغب کرتی ہیں اور پسپائیاں ہی پیش قدمی کی طرف لے جاتی ہیں، راہیں مسدود ہونے ہی پر ہم جان توڑ کر دوسری راہیں ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جب ایک میدان میں ہم کو شکست ہوجاتی ہے تو ہم اپنے لئے دوسرے میدان ڈھونڈھتے ہیں

عزیز من! قسمت نے اگر دغادی اور تم امتحان میں اس بار اچھے نمبر نہ لے سکے تو کیا!

تو اپنی سرنوشت پھر اپنے قلم سے لکھ خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

زندگی کی یہی ابتدائی شکستیں، آیندہ کی فتوحات کا پیش خیمہ ہیں، تم اپنی قوتِ عمل کو بروئے کار لاؤ، مستعدی سے اپنے کام میں لگ جاؤ، (کیونکہ کامیابی کے لئے قابلیت سے زیادہ محنت کی ضرورت ہوا کرتی ہے) مایوسی کو نزدیک تک نہ پھٹکنے دو، یہ جمود پیدا کرے گی، اور جمود موت کا دوسرا نام ہے، اگر تم شکستہ دلی سے بچے رہوگے، تو یقین رکھو، کامیابی تمہارے قدم چومے گی، اور یہ کامرانی تم کو اس لئے بھی پہلے سے زیادہ عزیز ہوگی کہ تم نے انتہائی محنت کے بعد اس کو حاصل کیا ہے۔

کامیاب صرف وہی ہے جو دل و جان اور روح کی گہرائیوں اور جسم کی پوری صلاحیت سے سرگرم عمل رہتا ہے، عروسِ کامیابی اس سے کم قیمت پر ملنے سے رہی۔

تمہارا باپ

بیٹے کے نام۔

امرت سر ۔ ۳ر جنوری ۱۹۵۱ء

جانِ پدر!

نور اور نار میں فرق یہ ہے کہ نور حیات افروز ہے اور نار حیات سوز، سنسکرت میں اس کو "اگنی" کہتے ہیں، اور اُردو میں "آگ" مہابھارت نے ایک معنی خیز لفظ "اودیتا" استعمال کیا ہے، جس کے معنی ہیں "متبرک آگ" دوسرے لفظوں میں اس کو "جاں بخشی شرارہ" کہا گیا ہے، بابل کے ایک گیت میں آگ کو اس طرح خطاب کیا گیا ہے، "والیِ دو جہاں! آسمان کے عالی نسب فرزند جہان کی تمام اشیاء کی تراش تجھی سے ہے"۔ مصر میں سورج کے لئے بھی وہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں، جو آگ کے لئے، اور چاند سورج کو اُن کے اور دیوتا پت آ (PTAH) کی آنکھیں بیان کیا گیا ہے، ہندوستان میں "اگنی" کو جہاں شمسی خوبیوں کا حامل سمجھا جاتا ہے، وہاں اُس کے متعلق یہ بھی خیال ہے کہ قیامت کے دن سورج کی تپش ہی سے دُنیا فنا ہوگی۔

امریکہ میں کئی اقوام سورج اور آگ میں رشتہ جوڑے ہوئے ہیں، جنوبی امریکہ کی بولی میں سورج کا لفظ آگ کے لفظ سے ماخوذ ہے، اور وہ سورج کو "بھیانک آگ" کے نام سے پکارتے ہیں، اُن کی روایات میں سورج "حیات کو بالیدگی بخشنے والا" اور "تخم حیات" بیان کیا گیا ہے، مینک سیسکو میں "آگ کا دیوتا" ہی اُن کا قدیمی دیوتا ہے جو ہر طرح کی تقدیس کا سزاوار ہے۔

آگ کو دھاتوں سے بھی نسبت دی گئی ہے، مصری دیوتا ہورس (HORUS)، بیک وقت آگ کا دیوتا بھی ہے اور دھاتوں کا بھی مصری دیوتا "پت آ" (جو صناعوں کا دیوتا بھی ہے) کی قلمی تصویر میں ظاہر کیا گیا ہے کہ "اُس کی داڑھی میں سونے کے بال کھچڑی ہو رہے ہیں"۔ ہندو گرنتھوں میں بھی سورج اور سونے کا ذکر یک جا آتا ہے، کہ سونا اگنی کی اولاد میں سے ہے، اگنی کے دانت سونے کے ہیں، داڑھی سنہری ہے، جسم سونے کا، بال بھورے، سواری کا رتھ اور گھوڑے سنہری، یہ بھی اعتقاد تھا کہ آگ پانی سے پیدا ہوئی تھی، اور اسی نسبت سے مہابھارت میں پنجاب کے پانچ دریاؤں کو "آگ کی ماں" کہا گیا ہے۔

اگنی دیوتا کی بجلی اور بارش کے دیوتاؤں سے قرابت صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ کئی اور ملکوں میں بھی مانی جاتی ہے، بابلی منتروں اور دعاؤں میں آگ اور پانی میں یک جہتی بتائی گئی ہے، "گے لک" (GAELIC) روایات میں جگنو کو بھی

آگ کا مظہر حقیقی ظاہر کیا گیا ہے کہ پرواز کے وقت روشنی دیتا ہے۔

انگلستان میں پارسیوں کی طرح آگ کو بجھنے نہیں دیتے تھے، اور اپنے گھروں میں ہر سال "نئی آگ" جلاتے تھے اور اُس کو "آسمانی آگ" کا نام دیتے تھے، میکسیکو اور روم میں آگ کی حفاظت کے لئے کنواری لڑکیاں مامور تھیں، مردوں کو جلانے کی رسم میں بھی یہ جذبہ کارفرما رہا ہے کہ مردہ روحیں آگ کے ذریعہ بہشت میں داخل ہو جاتی ہیں، ہومر (HOMER) کی الیڈ (ILIOD) میں اچ لیز (AOHILES) کے دوست پات روک لس (PATROCLUS) کا بھوت خواب میں آکر کہتا ہے کہ جب تک میرا مُردہ جسم آتش نہیں کیا جاتا، مجھے بہشت نصیب نہ ہوگا، ہومر کی اوڈی سس (ODYSSEUS) میں ال پی نور ——— ELPENOR ملاح کی بھی یہی پکار ہے۔

یونانی روایات کے مطابق آگ صرف آسمانوں میں دیوتاؤں سے مخصوص تھی، دُنیا والے اُس سے ناآشنا تھے، پرومی تھیس (PROMETHEUS) نامی ایک شخص دیوتاؤں کے ہاں سے آگ چُرا کر زمین پر لے آیا، زیوس (ZEUS) دیوتا از حد خفا ہوا، اور پروی تھیس کو کوہ قاف کی ایک چٹان کے ساتھ زنجیروں میں جکڑ دیا، اور چیلوں کو حکم دیا کہ اُس کے گردوں کو بلا ناغہ چیر پھاڑ کر کھا جایا کریں، اس طرح ہر روز اس کے جسم میں دو نئے گردے ڈالے جاتے اور ہر روز چیلیں اُس کا جسم پھاڑ کر گردوں کو نکال کر کھا جاتیں وہ بیچارہ شدت درد سے ہر وقت تڑپتا رہتا، اس ضمن میں ایک اور کہانی بھی رائج ہے، آگ کا دیوتا ہیپاس ٹوس (HEPHAESTOS) زیوس کی اولاد میں سے ہے، یونانی دیوتا عام طور پر خوش شکل اور خوب رو بیان کئے جاتے ہیں، مگر یہ بیچارہ بہت بدصورت تھا اور لولا بھی، اس کی ماں نے اُس کی شکل سے بیزار ہو کر اُس کو آسمان سے زمین پر پھینک دیا اور اس طرح دُنیا والوں کو ذہین پر آگ میسر آگئی۔

ہومر نے اپنی نظموں میں آگ کو آسمانوں کا باشندہ ظاہر کیا ہے، باوقار، دیوتاؤں کے اسلحہ خانے کا محافظ اور کارندہ، اس کے کارخانے میں زریں پیکر لونڈیاں اس کا ہاتھ بٹانے پر مامور ہیں۔

سکولوں (مدرسہ) میں داخلے کے وقت طلبا سے آگ کی سوگند لی جاتی تھی، کہ یہ صناعی، فنونِ لطیفہ، بافندگی اور زراعت کا دیوتا مانا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور آگ بھی ہے، بڑی ہولناک، جس کے متعلق کہا گیا ہے:-

آں آتش سوزندہ کہ عشقش لقب است — در پیکر کفر و دیں چو سوزندہ تب است
ایمان دگر و کیش محبت دگر است — پیغمبر عشق نے عجم نے عرب است

تم نے تو صرف نور اور نار کے متعلق پوچھا تھا، ہم نے تم کو اور بھی کیا کیا بتا دیا کہ تم نے اپنی کیمبرج کی کتابوں میں بھی نہ دیکھا ہوگا، اور وہ بھی بغیر کسی فیس یا معاوضے کے!-

تمہارا باپ

امرت سر - ۱۳ فروری ۱۹۵۶ء

رائے بہادر لالہ پرکاش چند مہرہ سابق صدر بلدیہ۔ امرت سر

مشفق دیرینہ!

سودا اور فغاں ہمعصر تھے، فغاں کے جس قطعہ کا آپ نے ذکر کیا ہے، وہ یوں ہے:-

تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں — انصاف کو نہ چھوڑ محبت اگر گئی،
آخر فغاں وہی ہے اُسے کیوں بھلا دیا — وہ کیا ہوئے تپاک وہ اُلفت کدھر گئی

سودا کو یہ قطعہ پسند آیا، اور معشوق کی طرف سے فغاں کو یہ جواب لکھا کہ :-

سن اے فغاں جہان میں عاشق جو ہو گیا — معشوق سے اسی روش اس کی گزر گئی
شیریں نے جو رکب نہ کیا کوہکن کے سر — مجنوں پہ کیا جفا تھی کہ لیلیٰ نہ کر گئی
کل ہی پڑی سسکتی تھی بلبل چمن کے بیچ — ذرہ نہ اُس کے حال پہ کل کی نظر گئی
پروانے رات شمع سے اتنے جلے کہ صبح — خاکستر اُن کی لے کے صبا دوش پر گئی
میں تازہ کیا کیا ہے کہ بدنامی کو مرے — آوازِ آہ و نالہ تری گھر بہ گھر گئی
حرمت رکھی نہ رعد کی فریاد نے تری — رونے سے تیرے آبروئے ابرِ تر گئی
لوہو سے ترے سر کے ہے دیوار گھر کی سُرخ — آنکھوں سے موج خون کی بیرون در گئی
دل کو ترے نہیں ہے اگر تابِ دردِ ہجر — تو کارِ عشق سے یہ زباں لال کر گئی

معشوق نے بلا تکلف ظلم کا اعتراف کر لیا ہے، بلکہ اُلٹا گلہ کیا ہے، کہ اگر تاب ضبط نہ تھی، تو وادیِ عشق میں قدم کیوں رکھا؟ میری رسوائی اور خواری کا باعث کیوں بنا؟

سودا اب فغاں کی طرف سے معشوق کو جواب دیتا ہے :-

القصہ خط کو پڑھ کے یہ اُن نے کہا کہ خیر — تیرے ہی دل کی مہر نہ جانوں کدھر گئی
شیریں کی ایک میں نہ کہوں ورنہ بارہا — لیلےٰ جدھر تھی وادیٔ مجنوں اُدھر گئی
جاری ہوا تھا خوں رگِ مجنوں سے وقت فصد — لیلیٰ کے پوست بال اگر نیشتر گئی
ظالم کرور گل کا گریباں ہوا ہے چاک — اک عندلیب گر اجل اپنی سے مر گئی
پروانہ کون سا نہ جلا شام کو کہ شمع — روتی ہوئی نہ بزم سے وقت سحر گئی
یہ گفتگو تو قطع نظر اس سے تجھ کو کیا — مجھ سے جفائے ہجر کی طاقت اگر گئی
میرے لہو سے ہے مری دیوار گھر کی سُرخ — میری ہی موج خوں مرے بیرونِ در گئی
شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشک سرخ کا — تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

اس سلسلہ میں حافظ کو بھی سُن لیجئے۔ کہتا ہے :-

صبحدم مرغِ چمن با گلِ نوخاستہ گفت — نازکم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نہ رنجیم دلے — ہیچ عاشق سخنِ تلخ بہ معشوق نہ گفت

مگر سودا ہجو کا بادشاہ تھا، سامنے کی بات کو کیونکر چھوڑتا۔

مغربی شاعری میں بھی یہ رونا دھونا، یہ آہ و بکا، یہ چھیڑ چھاڑ، یہ گریہ و زاری، یہ گلہ گزاری چلی آ رہی ہے، شیکسپیر کے گیت (SONNETS.)۔ کیٹس کی سنگ دل حسینہ (LA BELLE DAME SANS MERCI.) والی نظم یہی کچھ تو ہے، حق تو یہ ہے کہ دُنیا بھر کے شاعروں کا یہ دل پسند مضمون ہے۔

والسلام

خادم

برہم ناتھ دت

امرت سر - ۱۴ر جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

رائے بہادر پرکاش چند مہرہ صاحب پرکاش - سابق صدر بلدیہ - امرت سر۔

لو بھائی ! یہ داستان بھی سن لو :-

بے عشق نشانِ نیک و بد نیست

چیزے کہ ز عشق نیست خود نیست (جامی)

ابتدائے آفرینش میں، رگ وید کے مطابق، بزم جہاں کی آرائش کا پہلا شاہکار "پیار" ہی تھا، زندگی کا پہلا تخم، اور زندگی کے اولین تخم کی پہلی کوپل

ہستند افلاک زادۂ عشق

ارکان بزمین فتادۂ عشق

"ژند اوستا" میں پیار کو دخترِ یزداں، بتایا گیا ہے۔

ہم چرخ جلال را تو مہری

ہم برج جمال را تو ماہی

انجیل میں یسوع کو اُس کا آسمانی باپ "میرا پیارا بیٹا" کہکر پکارتا ہے، سلیمان اپنے غیر فانی گیتوں میں، خدا کے حضور اپنا "پیار" ہی نذر کرتا ہے اور کہتا ہے "تمھارا پیار شراب سے کہیں زیادہ سرور انگیز ہے، اور میں تمھیں روح کی گہرائیوں سے پیار کرتا ہوں" قرآن مجید میں "الرحمٰن و الرحیم" اسی تصور کی تائید و تفصیل کرتے ہیں، یہ نظریات مشرقی اقوام کے رجحانات کے مظہر ہیں۔

مغرب میں پہلے یونان اور اس کے بعد روم کو تہذیب و تمدن کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، ان دونوں ملکوں کے لوگوں کی ذہنی پرواز بھی مشرقی نظریات کا پہلو لئے ہوئے ہے، ارسٹوفینز کے مطابق "سیاہ پروں والی رات نے، موت کی آغوش میں ہوا کا تخلیق کردہ ایک انڈا رکھا، موسموں کی گردش اور تغیر سے اُس انڈے میں سے "پیار" پھوٹ پڑا، سب کا چہیتا اور لاڈلا، سونے کے پروں سے آراستہ"۔ اُن کے خیال میں :-

بعالم ہر کجا دردو غمے بود

بہم کردند عشقش نام کردند

"پیار"، ظلمت اور موت کے اتصال سے عالم وجود میں آیا، یونانی شاعر ہے سی آڈنے "پیار" کی تخلیق سمندر کی جھاگ سے بتائی ہے اور شہرۂ آفاق نابینا شاعر ہومر نے اس "خوبصورت اور سنہری دیوی" کو دیوی ڈی آنا کے بطن سے دیوتا زیوس کی بیٹی کہا ہے اور سقراط کے مکالمہ سمپوسیم میں اس کو "دُنیا کی تسکین، طوفانوں کا سکون، اور دکھیوں کا آرام" بتایا ہے۔

رومن، تصور خیالات کی رنگینی اور الفاظ کی سحر آفرینی کا مرقع ہے، کیا خوب ارشاد ہوتا ہے، "حسن اُس کا ذاتی جوہر ہے، اس کے حضور باد نسیم کی یہ حالت ہے کہ :-

از برائے شرف بنوک مژہ خاکِ راہ تو رفتنم ہوس است

طوفان اُس کے حضور ساکت، پھول فرش راہ اور لہریں اس کے تصور میں بے تاب ہیں، وہ خود بقعۂ نور، زمان اور مکان کی ملکہ ہے۔

در قصر تو چرخ آستانے

کیواں بدرِ تو پاسبانے

قمری اُس کا مقبول پرندہ ہے اور منہدی اُس کا دل پسند پودا۔

یونانی اُس کو "افرو ڈائیٹ" کہتے ہیں اور رومن اُس کو "وینس" مگر دونوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں "پیار کی دیوی" رومن نے "پیار" کے تخیل کو ایک نہایت ہی حسین کہانی کے ذریعہ بیان کیا ہے، محبوبہ کا نام "سیکی" ہے، جس کے معنی ہیں "تیزی اور روح" اور عاشق "کیوپڈ" دو پروں والا دیوتا "وینس" پیار کی دیوی کا اکلوتا بیٹا۔

استعارے میں سیکی، اُس روح کا نام ہے جو مصائب کی بھٹی سے نکل کر کندن بن گئی ہو، مصور اُس کو تیتری کے پروں سے آراستہ کرتے ہیں، ملٹن نے "کومس" میں اس کا ذکر کیا ہے، اور اس کو "آسودگی اور شباب" کی ماں بتایا ہے، ہارڈے نے "بدگمانی" کو فراق کا سبب بتایا ہے، کیسٹ نے ایک پوری نظم "اوڈ ٹو سیکی" (ODE TO PSYCHE) سیکی کی نذر کی ہے، اور مورنے "سمر سیٹی" (SUMMEEETE) میں اس کا تذکرہ کیا ہے، اُردو میں نیاز فتحپوری نے اس کہانی کو افسانے کے رنگ میں پیش کیا جو لاجواب اور بے مثل ہے، سحر حسن کی تصویر ملاحظہ ہو:- "کیوپڈ نے سیکی کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی تھا کہ تیر چٹکی سے چھوٹ گیا، کمان ہاتھ سے گر پڑی جلہ اُتر گیا اور کیوپڈ غش کھا کر گر پڑا، آہ کاش کوئی سیکی سے اُس وقت جا کر کہتا کہ جس محبت کی اس کو جستجو تھی، وہ خود اُس کی آرزومند ہے، جس عشق کی اُسے تمنا تھی، وہ خود اُس کا تمنائی ہے، صیاد خود اُس کا مجروح ہے، عشق خود اُس کا دیوانہ ہے"!

سینٹ پال، یسوع کا ہمعصر عیسائیت کا سب سے بڑا مبلغ اور رسول "پیار" کی عظمت اور بزرگی کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:-

"نیک عطیات کے حصول میں دل و جان سے طامع بنو، میں تم کو نادر سے بھی کہیں نادر ایک راستہ دکھاتا ہوں، اگر میں فرشتوں کا ہمنوا بن جاؤں اور جذبۂ محبت سے عاری رہوں تو میری آواز کی قدر خشک چنے کی کھنک جتنی بھی نہ رہے گی، "پیار" اذیتیں جھیلتا ہے، مگر پھر بھی شفیق ہے، کبر و نخوت سے معرا ہے، بد وضع نہیں ہے، بدی سے بیزار ہے، ناترسی سے ناآشنا ہے، سچائی کا ہم دم رہتا ہے، ایمان کا جویاں ہے، حوصلہ مند اور دل سوز ہے اور کبھی دغا نہیں دیتا۔

ہر چند کہ عشق دردناک است
آسایشِ سینہ ہائے پاک است

پُرانے عہد نامے میں "پیار" کی کہانی روت کی زبانی نہایت ہی دل سوز الفاظ میں بیان کی گئی ہے، نعومی، روت کی ساس، بیت الحم کی رہنے والی تھی، موآب کے ملک میں آکر بس گئی، تقدیر الٰہی سے اُس کا خاوند اور اُس کے دونوں بیٹے وفات پا گئے، نعومی دل برداشتہ ہو کر وطن کو لوٹی، اُس کی دونوں بہوئیں، عارفہ اور روت، اُس کے ساتھ جانے کے لئے بضد ہیں، مگر نعومی اُن کو باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے، عارفہ تو واپس لوٹ جاتی ہے، مگر روت یہ کہکر اُس کا منہ بند کر دیتی ہے:-

"تو منت نہ کر کہ میں تجھے چھوڑ دوں ..... اور لوٹ جاؤں، کیونکہ جہاں تو جائے گی، میں جاؤں گی، جہاں تو رہے گی میں رہوں گی، تیرے لوگ میرے لوگ ہوں گے اور تیرا خدا میرا خدا ہوگا، جہاں تو مرے گی میں مروں گی، اور دفن بھی ہوں گی، اور خداوند مجھ سے ایسا ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ کرے، اگر موت کے سوا کوئی اور چیز مجھ کو تجھ سے جدا کر سکتی ہے۔

پیار کی تخلیق ازل کے کارخانے میں (اقبال کے خیال میں) ان اجزا کی آمیزش سے ترتیب میں آئی:-

چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا — اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی، نور سے پاکیزگی پائی — حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابنِ مریم سے
ذرا سی پھر لوبیت سے شانِ بے نیازی لی — فلک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں — مرکب نے "محبت" نام پایا عرشِ اعظم سے

انسانی زندگی کے ہر قدم پر، پیدائش سے لے کر موت تک، بلکہ اس کے بعد بھی ہم کو "پیار" کی دلداریوں اور دلسوزیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ماں باپ، بہن بھائی، بیوی اور بچوں کے تعلقات، دوستوں کے مراسم، قوم و وطن، صلح و جنگ، مرض و صحت حتےٰ کہ ہر اُس کام میں جہاں ایک ذی روح کو دوسرے ذی روح سے واسطہ پڑتا ہے، انسان پیار کے رشتے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ "پیار" ہی تو ہے جو انسان کو حق و صداقت کی طرف لے جاتا ہے، اپنا نقصان کرکے، دوسروں کی بھلائی کا تلاشی ہے اپنی جان دے کر دوسروں کی راحت کے سامان پیدا کرتا ہے، اگر "پیار" نہ ہو تو تحقیق و جست جو کے دروازے بند ہو جائیں، انسان اور درندے ایک ہی صف میں کھڑے دکھائی دیں۔

محبّت کی داستان اتنی طویل ہے کہ :-

"سر ایں رشتہ ندانم زکجا بکشائم"

چٹکی جو کلی کوئل کو کی، اُلفت کی کہانی ختم ہوئی

اور اتنی طویل کہ رہتی دُنیا تک ختم نہ ہو :-

یک قصہ بیش نیست غم عشق، دیں عجب — از ہر کسے کہ مے شنوم نامکرر است

اور ایک اُردو شاعر کہتا ہے :-

ہم عشق کے ماروں کا اتنا سا فسانہ ہے — سمٹے تو میرا دل ہے، پھیلے تو زمانہ ہے

پائی رامس (PYRRMUS) کی کہانی اور بھی اس (ORPHEUS) کی داستان، کی اس (CEYX) کی روداد پائی، پگمالین (PYGMALION) کی روایت، ڈیڈو (DIDO) کا قصہ وامق و عذرا، لیلیٰ مجنوں، سوہنی مہیوال، ہیر رانجھا، مرزا صاحبان کی دل سوزیاں اور

ہمچو ہند و زن کسے در عاشقی دیوانہ نیست

سوختن بر شمع کشتہ کار ہر پروانہ نیست

کل ہی سل وار کی ایک بیس سالہ دیہاتی لڑکی کا اپنے مُردہ خاوند کی چتا پر جل مرنا "پیار" کی قربانگاہ پر نثار ہونے کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، مگر یہ بتاؤ، اس داستان کے سننے کا مقصد کیا ؟۔ کیا کوئی بات نہیں بن پڑتی ؟۔ اگر یہی ہے تو پھر بتاؤ کس بحر، ردیف اور قافیہ میں مرثیہ شروع کردوں ۔ والسلام

احقر

برہم ناتھ دت

اگر آپ ادبی و تنقیدی لٹریچر چاہتے ہیں تو یہ سالنامے پڑھئے

اصنافِ سخن نمبر، قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول ۔ حسرت نمبر، قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول ۔ مومن نمبر، قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔
ریاض نمبر، قیمت دو روپیہ علاوہ محصول ۔ داغ نمبر، قیمت آٹھ روپیہ علاوہ محصول ۔ (جملہ ۲۵ء)

لیکن یہ سب آپ کو بیس روپیہ میں معہ محصول مل سکتے ہیں، اگر یہ رقم آپ پیشگی بھیجدیں۔

منیجر نگار، لکھنو

باب الانتقاد

حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی نظم "بھری برسات"

(سماک رامحؔ)

یہ نظم، نقوش کے ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) میں شایع ہوئی ہے۔ اس میں برسات کی گوناگوں رنگینیاں اور رعنائیاں دکھائی گئی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ جذبات اور شاعرانہ توجیہات کے لحاظ سے بڑی کامیاب نظم ہے، لیکن افسوس ہے کہ جابجا نامطبوع تکلف و آورد اور تاویلات بارده سے خالی نہیں۔ اس کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے:-

۱۔ ہاں دیکھ ذرا دیکھ مرے سرو لب جو — گھنگھور گھٹاؤں کا یہ چلتا ہوا جادو
زرتار ڈوپٹوں کے یہ اڑتے ہوئے پلو — یہ کنج یہ رندانِ سیہ مست کی یا ہو
اے دولتِ پہلو
ہاں تان اڑاتا ن قمر پارہ و گلرو — اے دولتِ پہلو

"اے دولتِ پہلو" کی ہر بند میں تکرار ہے، کیونکہ اس جگہ شاعر کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ ایک معشوقہ قمر پارہ و گلرو اس کے پہلو میں ہے لیکن جسمانی نزدیکی کا تباد "دولتِ پہلو" سے زیادہ "زینتِ پہلو" میں پایا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی جگہ "زینتِ پہلو یا راحتِ پہلو" بدرجہا بہتر ہوتا۔

نظم میں ڈوپٹوں صاف صاف تحریر ہے حالانکہ صحیح لفظ دوپٹا ہے۔ دوپٹا، دو پاٹ سے مرکب ہے نہ کہ ڈوپاٹ سے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ غلطی کتابت کی ہو۔

۲۔ ساحل پہ یہ اڑتے ہوئے جنت کے نظارے — افلاک پہ یہ سرخ دوشالوں کے کنارے
بجلی کی لپک میں یہ حسینوں کے اشارے — اڑتے ہوئے دریا کے ابلتے ہوئے دھارے
دھاروں میں گھری ناؤ کے مڑتے ہوئے چپو

جوشؔ صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ بجلی چمکتی ہے اور کوندا لپکتا ہے۔ بجلی چمکنے کا نتیجہ کڑک ہوتا ہے، کوندے کے بعد کڑک نہیں ہوتی اس لئے انھیں بجلی کی چمک کہنا چاہئے تھا یا کوندے کی لپک۔ گو منظر کی خاموش گویائی کے پیشِ نظر کوندے کی لپک نظم کرنا زیادہ بلیغ ہوتا۔

جوشؔ صاحب کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ دریا میں کئی دھارے نہیں ہوتے ایک ہوتا ہے جو تیز بہتا ہے اور اس میں پڑنے کے بعد ناؤ کا کھینا دشوار ہو جاتا ہے۔ دھاروں کی جگہ وہ دھارے بھی لکھ سکتے تھے۔ علاوہ اس کے ناؤ دھارے میں پڑتی ہے، گھرتی نہیں۔

۳۔ کیا جوش میں ہیں جھاگ اڑاتے ہوئے نالے — بادل کے خزانوں کے ہیں ٹوٹے ہوئے تالے
گلیوں کے یہ کھانچے ہیں کہ چھلکے ہوئے تھالے — دبکے ہوئے چھجوں کے تلے خونچے والے
ٹاپو میں کہیں راہ کہیں راہ میں ٹاپو

تیسرا مصرع جس طرح موزوں ہوا ہے اُس سے خیال درختوں کے تھالوں کی طرف جاتا ہے اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بغیر درختوں کے تھالے اور وہ بھی بیچ گلی میں کہاں سے آگئے۔ ذرا سے تغیر سے یہ عیب رفع ہو سکتا تھا یعنی تھالوں کی نوعیت مقرر کر دی جاتی:-

"کھانچے نہیں اب گلیوں میں پانی کے ہیں تھالے"

راہ میں ٹاپو ہونا تو درست ہے مگر ٹاپو میں راہ ہونا بے معنی سی بات ہے۔

۴- کس ناز سے وہ دیکھ گھٹا باغ میں لوٹی نوعمر فضا جھوم گئی کھول کے چوٹی
برکھا سے کھری ہو گئی جو چیز تھی کھوٹی جنبش میں اِدھر سبزہ اُدھر بیر بہوٹی
ہر باغ میں ہر راغ میں ہر راہ میں ہر سو

"وہ دیکھ" کا ٹکڑا بھرتی کا ہے۔ "البیلی گھٹا" کہنا بہتر ہوتا:- "کس ناز سے البیلی گھٹا باغ میں چمکی"

اسی طرح دوسرے مصرع میں نوعمر فضا کی جگہ اگر بدمست فضا کہتے تو چوٹی کھول کر جھومنے کی وجہ جواز بھی مہیا ہو جاتی۔

۵- پتی کوئی کالی ہے تو بوٹا کوئی گورا لہریز ہے ہر نخل کے تھالے کا کٹورا
ہر نرگسِ شہلا میں نئی عمر کا ڈورا لڑکوندا ہر اک گل ہے تو ہر خار ہے گبھرو

سب سے بڑا عیب اس بند میں یہ ہے کہ غالباً پانچواں مصرع موزوں کرنے کے لئے انھیں کوئی قافیہ نہیں ملا — حالانکہ وہ اس طرح ہو سکتا تھا:- "وہ نیند کے عالم میں جھکورے پہ جھکورا"

دوسرا نقص یہ ہے کہ پتی کو کالی ظاہر کیا گیا ہے، حالانکہ یہ بالکل خلاف حقیقت ہے، کسی درخت کی پتی سیاہ نہیں ہوتی، اگر وہ یوں کہتے :- "پتی کوئی سونلی ہے تو بوٹا کوئی گورا"۔ تو یہ تقابل زیادہ دلچسپ ہو جاتا۔ تیسرا نقص یہ ہے کہ محض وزن پورا کرنے کے لئے انھوں نے نرگس سے پہلے ہر کا اضافہ کیا — "ہر نرگس شہلا" کہنا بے معنی سی بات ہے۔ مصرع اس طرح شاید بہتر ہوتا:-

وہ دیدۂ نرگس میں نئی عمر کا ڈورا

لڑکے کو لڑکوندا کہنا بھی غلط ہے اور گبھرو کو گبھرو کہنا بھی صحیح نہیں۔ یہ مصرع یوں ہونا چاہئے:-

"نوخیز ہر اک گل ہے تو ہر خار ہے گبرو"

۶- خود سوچ دوالے ہوں نہ کس طور سے لمحات جب ناز سے اُبھرے ہوئے کولے پہ دھرے ہات
دن کو ہو فروشندہ و رقصندہ جواں رات کیا بات ہے برسات ہے برسات ہے برسات
لہراؤں سماوات پہ چل جائے جو قابو

لمحات کا دوالے ہونا بالکل بے معنی بات ہے اور تیسرا مصرع کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ علاوہ اس کے جوش صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ دوشیزگی میں عورت کے کولے اُبھرے نہیں ہوتے۔ دوسرا مصرع شاید اس طرح بہتر ہوتا:-

"اٹھلاتی ہوئی ناز سے کولے پہ دھرے ہات"

دن کو رقص پر ہرانا بھی عجیب بات ہے، بڑی آسانی سے کہہ سکتے تھے:- "جا پہونچوں سماوات پہ چل جائے جو قابو"

۷- شاخوں میں جھما جھم ہے فضاؤں میں روانی بہتی ہوئی چہکار مچلتا ہوا پانی
بھونرے ہیں کہ اُڑتی ہے کہانی پہ کہانی اک خیمہ ہے اور خیمۂ رنگین جوانی
بھیگے ہوئے پودوں کی یہ چبھتی ہوئی خوشبو

بھیگے ہوئے پودوں کی "چبھتی ہوئی خوشبو" بھی عجیب بات ہے۔ بھیگنے کے بعد بوجھل پودوں کی خوشبو میں چبھن کہاں۔ بھونرا موسم بہار کی چیز ہے، برسات کی نہیں، اس لئے اس کا ذکر بالکل بے محل ہے۔ چوتھا مصرع یکسر تکلف و آورد ہے۔ جوانی کو "خیمۂ رنگین" کہنا

کوئی معنی نہیں رکھتا۔

۸۔ ہر مست صدا خواب زلیخا کی ہے تعبیر ہر زمزمۂ ہوشربا حسن کی تفسیر
تصویر میں آواز ہے آواز میں تصویر اک کیف کی پازیب ہے اک نشے کی زنجیر
باغوں میں گھنی چھاؤں میں کویل کی یہ کوکو

اس بند کا چوتھا مصرع بالکل الگ ہے، اور اک، اک کا استعمال بھی بڑی مبہم سی بات ہے، معلوم نہیں اس کا اشارہ کس طرف ہے، علاوہ اس کے "باغوں میں گھنی چھاؤں" کے بدلے "باغوں کی گھنی چھاؤں" کہنا چاہئے تھا۔

۹۔ ہر لمحہ۔ واں تند عناں ابر کا توسن ہر آن مسکتا ہوا افلاک کا دامن
ہر وقت نئے رنگ کی اُٹھتی ہوئی چلمن ہر لمحۂ پردار میں پرواز کی سن سن
ہر ساعت سرشار میں نازم آہو

حضرت جوش نے ہر مصرع کے آغاز کا التزام لفظ ہر سے کیا ہے ورنہ تیسرا مصرع بدلتے مناظر کی مصوری اس طرح بہتر اسلوب کرتا

چھٹتی ہوئی چلمن کہیں اُٹھتی ہوئی چلمن

خود چلمن میں نئے نئے رنگ کہاں؟ پس پردہ البتہ جلوہائے رنگا رنگ ہوتے ہیں۔ چوتھا مصرع یک لخت بھرتی کا ہے۔ نازم آہو بھی مہمل بات ہے۔ بڑی آسانی سے "شان رم آہو" کہہ سکتے تھے۔

۱۰۔ شیشوں پہ یہ دُربار جھلکتی ہوئی بوندیں شاخوں سے یہ مے ریز ٹپکتی ہوئی بوندیں
یہ دوب کے ریشوں سے ڈھلکتی ہوئی بوندیں یہ آم کے پتوں پہ کھنکتی ہوئی بوندیں
بوندوں کے نجیروں پہ یہ بجتے ہوئے گھنگرو

دوب وہ سبزہ ہے جو زمین سے بالکل ملا ہوا ہو۔ اُس سے بوندیں نہیں ڈھلکتیں۔ مصرع یوں موزوں کر سکتے تھے:۔

"وہ فرش پہ سبزے کے ڈھلکتی ہوئی بوندیں"

مجیروں کی رعایت سے "چھنکتے ہوئے گھنگرو" کہنا زیادہ موزوں ہوتا یعنی اِدھر مجیرے بج رہے ہیں اُدھر گھنگرو چھنکتے ہیں۔

۱۱۔ یہ سر پہ کڑکتی ہوئی ساون کی گھٹائیں کھلتی ہوئی بن میں یہ جواہر کی دکانیں
موجوں میں یہ آنکھیں یہ ہواؤں کی زبانیں بھیگے ہوئے لمحوں کی یہ ڈوبی ہوئی تانیں
بہکی ہوئی راتوں کے بھٹکے ہوئے جگنو

کھلتی ہوئی دکانوں کی جگہ کھلی ہوئی دکانیں کہنا چاہئے تھا:۔ ع "جیسے ہوں کھلی بن میں جواہر کی دکانیں"۔ آراستگی کا مفہوم کھلتی ہوئی دکانوں میں نہیں پایا جاتا۔ تیسرا مصرع آورد کی بدترین مثال ہے۔ چوتھے مصرع میں ڈوبی ہوئی تانیں بھی قابلِ اعتراض ہیں ڈوبی ہوئی آواز وہ ہے جو بہ مشکل سنائی دے، اس لئے جب تک سُروں میں ڈوبی ہوئی تانیں نہ کہا جائے کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا، "بہکی ہوئی راتوں کے یہ بھٹکے ہوئے جگنو"۔ یہ مصرع کہیں بہتر ہوتا اگر اس طرح ہوتا:۔ "بہکی ہوئی راتوں کے یہ بہکے ہوئے جگنو"۔

۱۲۔ گھنگھور گھٹاؤں میں یہ خوابوں کے فسانے بوچھار میں باروں کے یہ ٹوٹے ہوئے دانے
پُروائی کی سن سن میں یہ شاخوں کے ترانے بہتے ہوئے یہ سُر یہ برستے ہوئے گانے
یہ مور کی جھنکار پپیہے کی یہ پی ہو

مور کی آواز کو جھنکار نہیں چنگھاڑ کہتے ہیں۔ جھنکار نرم آواز ہے مثلاً پازیب، چھاگل وغیرہ کی جھنکار۔ مور ہاتھی کی طرح چنگھاڑتا ہے۔ پپیہے کی آواز کو تو "پی پی"۔ "پیو پیو" یا "پیہو پیہو" کہتے ہیں۔ خالی پیہو نہیں۔

۱۳- اک سمت مغنیٔ جنوں خیز و خروشے اک سمت بت لالہ وشے عشوہ فروشے
اک سمت سرود و سخن و سوز کے گوشے اک سائے میں صہبا کے مہکتے ہوئے خوشے
اک سیج پہ برہا کے دہکتے ہوئے آنسو

لالے میں سُرخی کے ساتھ سیاہ داغ بھی ہوتے ہیں۔ اسی لئے محتاط شاعر بت لالہ وشے کبھی نہیں کہتے بلکہ لالہ رخ کہتے ہیں تاکہ صرف لالے کی سرخی کی طرف دھیان ہوجائے۔ صہبا، انگور کی سرخ شراب ہے۔ لہذا صہبا کے خوشے کہنا صحیح نہیں۔ اک سائے کہنا زبان کو کند چھری سے ریتنا ہے۔ تین مصرعوں کا آغاز اک سمت سے ہوا ہے چوتھے میں بھی یہی تلازمہ ہونا چاہئے تھا۔ ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے چوتھے مصرع کی یہ ساخت ہونا چاہئے تھی۔ ع "اک سمت سرِ تاک مہکتے ہوئے خوشے"

پانچواں مصرع :۔ "اک سیج پہ برہا کے دہکتے ہوئے آنسو"۔ نظم کی آہنگ میں بُری طرح خلل انداز ہے، پوری نظم میں جوش و خروش ہے، امنگ ہے ترنگ ہے، ربودگی و سرخوشی ہے کہ ناگاہ ایک سیج جس پر برہا کے آنسو دہک رہے ہیں نہ معلوم کہاں سے آجاتی ہے اور وہ بھی اُس وقت جب معشوق بغل میں ہے اور آپ اُس سے مخاطب ہیں۔ چوتھا مصرع یوں ہونا چاہئے :۔

سنبل کی طرح دوش پہ بکھرے ہوئے گیسو

۱۴- یہ پستیٔ یہ گیندیٔ یہ سرمیٔ بادل یہ فاختیٔ سردیٔ فیروزیٔ مخمل
یہ نقریٔ یہ کتھیٔ ۔ اگریٔ آنچل اور فالسیٔ طشت میں یہ چمپئی بوتل
بوتل میں تھرکتا ہوا یہ شعلۂ دارو

دارو بمعنی شراب ٹھیٹھ ہندی ہے اور بمعنی دوا فارسی۔ اضافت کے ساتھ لانے سے اس کے معنی دوا لینے ہوں گے نہ کہ شراب ایک ترمیم ذہن میں آئی ہے :۔ "بوتل میں تھرکتی ہوئی دو آتشہ دارو"

۱۵- ہر سجدۂ صد دانہ ہے اک زلف تہ دام ہر سجدۂ شکرانہ ہے اک جست سوئے جام
ہر گردش پیمانہ ہے اک رقص خوش انجام ہر نعرۂ رندانہ ہے اک نغمۂ الہام
ہر لغزشِ مستانہ ہے اک قوتِ بازو

پورا بند آورد و تصنع ہے۔ کوئی پوچھے کہ سجدۂ صد دانہ زلف تہ دام کیونکر ہوگیا اور زلف جو خود ہی دام ہے تہ دام کیونکر آگئی سجدے کو جست سے کیا ربط ہے۔ رقص کا خوش انجام یا بدانجام ہونا کیسا۔ نعرۂ رندانہ نغمۂ الہام کیونکر بن گیا ..... الہام کے بعد نعرۂ مستانہ ہوتا تو ایک بات بھی تھی لغزشِ مستانہ کا قوتِ بازو ہونا بھی عجیب بات ہے، قوتِ بازو کنایۃً چھوٹے بھائی کو کہتے ہیں۔ معلوم نہیں جوش صاحب نے کس معنی میں استعمال کیا ہے۔

۱۶- اس رت میں خرابات کی پوشاک ہے دھانی اور جوش کے ساغر میں خرابات کی رانی
اس شیخ سے کہدے کہ ارے دشمنِ جانی خاموش کہ اس وقت ہے موسم کی جوانی
رخشندہ بہر کوچہ و رقصندہ بہر کو

"اس شیخ سے کہدے" خلاف زبان و روزمرہ ہے۔ آپ کسے حکم دے رہے ہیں۔ شیخ تو سامنے موجود ہے۔ برسات میں خرابات کی پوشاک کا دھانی ہونا بجز اس کے نہیں ہوسکتا کہ :۔ "آگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب"۔
رخشندہ کہنے کا بھی کوئی محل نہ تھا، آوارہ کہنا چاہئے تھا :۔
"آوارہ بہر کوچہ و رقصندہ بہر کو"
اس طرح برسات کی وسعت و فتنہ سامانی کی طرف بھی اشارہ ہوتا۔

صُوفی فلاسفہ

ابن العربی

(نواب محمد عباس طالب صفوی)

شیخ الاکبر ابوبکر محی الدین بن محمد بن علی بن العربی الطائی الحاتمی کی ولادت سنہ ۵۶۰ھ (سنہ ۱۱۶۵ء) میں اسپین کے ایک شہر مرسیہ میں ہوئی[1] اور ۷۸ برس کی عمر میں ۲۸ ربیع الآخر سنہ ۶۳۸ھ (سنہ ۱۲۴۰ء) کو دمشق میں انتقال فرمایا[2]۔

ابن العربی ۳۷ برس کی عمر تک اسپین میں مقیم رہے اور سنہ ۱۲۰۲ء میں انھوں نے اسپین کو خیرباد کہکر ممالک اسلامیہ کی سیاحت اختیار کی[3] اور پھر انھیں اسپین آنا نصیب نہیں ہوا۔

پروفیسر نکلسن نے مشہور مورخ مقدسی کے حوالے سے اسپین کے مسلمانوں کی مذہبی حالت کا اس حال میں نقشہ کھینچا ہے کہ وہ صرف قرآن حکیم و موطا کو مانتے تھے اور اگر کوئی حنفی یا شافعی، اندلس میں آجاتا تھا تو وہ اُسے خارج البلد کردیتے تھے اور اگر کوئی معتزلی یا شیعہ آجاتا تھا تو وہ اُسے اکثر قتل کردیتے تھے[4]۔ امام مالک کے مذہب سے اس شغف اور داؤد ظاہری کے عقاید سے وابستگی کے باوجود[5] اندلس مسلمانوں میں صدیوں تک تصوف بھی مقبول رہا اور شاید اسی بنا پر المقری نے ابن العربی کے متعلق یہ الفاظ سپردِ قلم کئے کہ وہ مذہب کی رو سے باطنی تھے[6] اور چونکہ اسپین ڈاکٹر اولیری کے الفاظ میں اسلامی فلسفہ کا "ملجا و ماویٰ" ہونے کے ساتھ ساتھ یہودی فلسفہ کا بھی "گہوارہ"[7] تھا اور موسیو رینال کے الفاظ میں عیسائی مدرسۂ فکر کا بھی مرکز تھا[8]۔ بنابرایں ابن العربی کے افکار پر یہودی اور عیسائی نظریات کا دوسرے مسلمان اور صوفی فلاسفہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اثر ہوا۔ کبھی ابن العربی نے فایلو یہودی کی طرح[9] وسائط کو اسماء الٰہی سے تعبیر کیا۔ کبھی عیسائیوں کے عقیدۂ حلول کی ہمنوائی میں حضرت ابراہیم

---

[1] "البرہان الازہر فی مناقب الشیخ الاکبر" مصنفہ احد احفاد الشیخ الاکبر محمد رجب حلمی مطبوعہ مطبع السعادۃ مصر صفحہ ۴

[2] "تاریخ فلاسفۃ الاسلام" مطبوعہ حیدر آباد صفحہ ۴۰۰

[3] "A Literary History of the Arabs" page 399

[4] "A Literary History of the Arabs" page 408-9

[5] "عبرت نامۂ اندلس" مطبوعہ حیدر آباد۔ جلد ثانی۔ صفحہ ۲۷۷

[6] "A Literary ... tory of The Arabs" page 401

[7] "فلسفۂ اسلام" مطبوعہ حیدر آباد دکن۔ صفحہ ۱۹۷

[8] "فلسفۂ ابن رشد" مطبوعہ حیدر آباد صفحہ ۲

[9] "A History of Philosophy" By Thilly page 148

کے متعلق ارشاد فرمایا کہ:۔ "انما سمی الخلیل خلیلاً لتخللہ وحصرہ جمیع ما الصفت بہ الذات الالہیہ" یعنی حضرت ابراہیم کا لقب خلیل اس لئے ہوا کہ وہ تمام صفات الٰہیہ میں سرایت کر گئے تھے، یا اس لئے کہ حق تعالیٰ صورت ابراہیم میں سما گیا۔[1] حضرت محمد مصطفےٰ کے متعلق بھی ابن عربی نے اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے کہ "ہو اوّل الافراد الثلثۃ"[2] جس سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ افرادِ ثلثہ میں اول ہیں، اور عبدالغنی النابلسی نے اس کی یہ شرح فرمائی ہے کہ:۔ "انی قام بہا کل شیی من محسوس او موہوم فان کل شیی مما ذکر لہ عند نا روح نورانیۃ ونفس برزخیۃ وصورۃ ظلمانیۃ فروح کل شیی فی الملاء الاعلےٰ العرش ونفسہ فی الحضرات الفلکیہ السماویۃ وصورتہ فی العالم السفلی الارضی وہی افراد ثلثۃ علی ہذا الترتیب روح وجسم ونفس قلم ولوح وکتابہ آخرۃ وبرزخ ودنیا جنۃ واعراف ونار ذات وصفات او اسماء وافعال فہو صلی اللہ علیہ وسلم اول ہذا الافراد الثلثۃ"[3] یعنی ہر شے کی ایک روح ہوتی ہے ایک نفس اور ایک صورت۔ روح عرش پر ہوتی ہے نفس افلاک میں، اور صورت زمین پر اسی ترتیب سے قلم ولوح وکتاب، آخرت وبرزخ ودنیا جنت واعراف ودوزخ، ذات وصفات یعنی اسماء وافعال الٰہی ہیں، پس آنحضرت صلعم ان افرادِ ثلثہ کے اول ہیں۔

ابن العربی کے ان خلافِ اسلام تصورات کی طرف سب سے پہلے علامہ ابن تیمیہ کی نظر پڑی اور موصوف نے کبھی ابن العربی کو ان الفاظ میں ملحد کہا:۔

"فجاء الملاحدۃ الذین شارکوا ہؤلاء الملاحدۃ المتفلسفۃ وزعموا انہم اولیاء اللہ افضل من انبیاء اللہ وانہم یاخذون عن اللہ بلا واسطۃ کابن عربی صاحب الفتوحات والفصوص فقال انہ یاخذ من المعدن الذی اخذ منہ الملک الذی یوحی بہ الی الرسول"[4]۔

(ان فلاسفہ کے بعد ملحدین کا دور آیا جو عقاید میں فلاسفہ کی طرح تھے اور جو اپنے آپ کو اولیاء میں شمار کرتے تھے۔ انبیاء پر اولیاء کی فضیلت کے مدعی تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ براہ راست اللہ سے فیض حاصل کرتے ہیں مثلاً صاحب فتوحات مکیہ وفصوص الحکم یعنی ابن عربی جن کا یہ قول تھا کہ انھوں نے بھی اُسی معدن سے فیض حاصل کیا جس سے حضرت جبریل نے وحی حاصل کی تھی)۔

اور کبھی ان الفاظ میں:۔

"فان ابن عربی وامثالہ وان ادعوا انہم من الصوفیۃ فہم من صوفیۃ الملاحدۃ الفلاسفۃ لیسوا من صوفیۃ اہل العلم فضلاً عن ان یکونوا من مشائخ اہل الکتاب والسنۃ کالفضیل ابن عیاض وابراہیم بن ادہم وابی سلیمان الدارنی ومعروف الکرخی والجنید بن محمد وسہل بن عبداللہ التستری وامثالہم"[5]۔

(ابن عربی اور ان کے ہم مشرب لوگ اس دعوے کے باوجود کہ وہ صوفی ہیں حقیقتہً ملحد فلسفی صوفی ہیں اور مشائخ اہلِ سنت مثلاً فضیل، ابراہیم بن ادہم، الدارنی، معروف کرخی، جنید اور تستری کا کیا ذکر ابن عربی وغیرہ کا شمار اہلِ علم صوفیہ میں بھی نہیں کیا جا سکتا)۔

---

[1] "فصوص الحکم" ترجمہ مولانا عبدالقدیر۔ مطبوعہ حیدرآباد صفحات ۸۸۔ ۸۷۔ [2] "جواہر النصوص فی حلّ کلیات الفصوص" الجزء الثانی مطبوعہ مطبع عامرہ مصر۔ صفحہ ۳۰۸۔ [3] "جواہر النصوص فی حلّ کلیات الفصوص" صفحہ ۳۰۸۔ [4] "الفرقان بین اولیاء الرحمٰن واولیاء الشیطان" مطبوعہ مصر صفحہ ۴۳۔ [5] حوالۂ سابق صفحہ ۴۴۔

لیکن اسلام میں ابن العربی کے مخالفین کے ساتھ ساتھ اُن کے موافقین بھی پیدا ہوتے رہے اور پندرھویں صدی عیسوی میں علامہ مجدالدین فیروز آبادی اور علامہ جلال الدین سیوطی نے اور سولھویں صدی عیسوی میں علامہ عبدالوہاب شعرانی نے ابن العربی کی حمایت میں پرزور رسایل تصنیف کئے۔[1]

میری رائے میں ابن العربی سے اس والہانہ وابستگی کا قوی سبب یہ تھا کہ ان کے سحر طراز قلم کو نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی اور تاریخ فلاسفۃ الاسلام کے مصنف محمد لطفی جمعہ بھی ان کی تحریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فتوحاتِ مکیہ کو انھوں نے الہامی تالیف قرار دی ۔ مگر میری نظر میں ابن العربی کا طرز نگارش اُن کی سب سے بڑی خوبی ہونے کے ساتھ ساتھ بایں معنی اُن کا سب سے بڑا عیب بھی ہے کہ وہ الفاظ کے طلسم میں پھنس کر معانی سے اتنے بے خبر ہو گئے کہ اُن کے نظریات میں ہم آہنگی باقی نہیں رہی کبھی وہ حضرت ابراہیم میں حق تعالےٰ کے حلول کے قایل ہوئے، کبھی رسول اللہ ؐ کے متعلق تثلیث کا خیال ظاہر کیا، کبھی حروف کو اسرارِ الٰہی اور اُن کے علم کو "اشرف العلوم المخزونۃ عنداللہ" سمجھا[2] کبھی خدا کے مختلف مبارک ناموں کو مختلف اشیاء کا رب ثابت کیا[3] اور کبھی فلاطینس کی طرح اس عقیدہ کا اظہار کیا کہ تمام اشیاء خدا کی ذات سے ہویدا ہوئیں[4]

---

[1] "A Literary History of The Arabs" page

[2] "رسایل ابن العربی کتاب المیم والواو والنون" مطبوعۂ حیدر آباد۔ صفحہ ۲

[3] "مطلع خصوص الکلم فی معانی فصوص الحکم" مصنفۂ داؤد القیصری۔ مطبوعۂ بمبئی صفحہ ۷

[4] "کتاب المیم والواد والنون" مطبوعۂ حیدر آباد دکن صفحہ ۴

ہماری کتابیں

		قیمت	ڈاک خرچ
۱ —	پنڈت نہرو سے بات چیت ٹیبر منڈی	۲ روپیہ	۳۵ نئے پیسے
۲ —	ابوالکلام آزاد	۲ روپیہ	۳۵ نئے پیسے
۳ —	ہندوستان کا دستور	۱ روپیہ	۲۵ نئے پیسے
۴ —	بھارت کی لوک کہانیاں	۱ روپیہ	۲۵ نئے پیسے
۵ —	دیس دیس کی لوک کہانیاں	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
۶ —	اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
۷ —	خوشحالی کے لئے منصوبہ بندی	۷۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
۸ —	ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
۹ —	کیلنڈر کی اصلاح	۴۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
۱۰ —	ناپ تول کا میٹری نظام	۳۵ نئے پیسے	۱۰ نئے پیسے
۱۱ —	جواہر لال نہرو کی تقریریں نمبر ۱	۱۰ نئے پیسے	۸ نئے پیسے
	۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶	فی نمبر	فی نمبر

ملنے کا پتہ:- بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن - اولڈ سیکرٹریٹ - دہلی (۸)

DA 60/344

پانی کی دُنیا

آج بھی جبکہ انسان سمندروں کے سینہ کو چیرتا ہوا آزادی کے ساتھ جہاں چاہے چلا جاتا ہے، ہم اس کی مہیب لہروں اور شور و خروش کو دیکھ کر حیران رہجاتے ہیں اور سمندر کی عظمت کا ایک ناقابل بیان نقشہ ہمارے دلوں پر قایم ہوجاتا ہے، لیکن اب سے بہت پہلے جب انسان نے اول اول سمندر کو دیکھا ہوگا تو اس کے خوف و ہراس کا کیا عالم رہا ہوگا ۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے ۔

اول اول تو انسان یہ جرأت ہی نہ کرسکا ہوگا کہ وہ سمندر میں قدم رکھے، کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ پہاڑوں کی چٹانیں بھی اس کی لہروں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، انسان کا کیا ذکر ہے ۔ لیکن جب تجربہ سے اسے معلوم ہوا کہ سمندر گھٹتا بڑھتا بھی ہے اور کناروں پر پانی کا زور کبھی کبھی کم ہوجاتا ہے تو اس نے سوچا ہوگا کہ اس موقع سے فایدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، لیکن اس کی صورت کیا ہوسکتی ہے ۔ اس کا علم اول اول اسے پانی پر تیرتے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں کو دیکھ کر ہوا ہوگا، چنانچہ پہلے پہل اس نے درخت کے تنوں سے کام لینا شروع کیا جن پر بیٹھ کر وہ سمندر کے کنارے کنارے بعض مقامات تک پہونچ سکتا تھا ۔ اس کا ثبوت ان لکڑی کے ڈھانچوں سے ملتا ہے جو سواحل ڈنمارک پر دستیاب ہوئے ہیں اور جن سے سات ہزار سال قبل مسیح کشتی کا کام لیا جاتا تھا ۔

اس کے بعد ہزاروں سال تک انسان نے اس سلسلہ میں کوئی ترقی نہیں کی، لیکن جب فنیقیا، کریٹ اور جزائر ایجین کی تہذیب اُبھری تو بحر روم میں جو بہت چھوٹا اور نسبتاً ساکن حصۂ آب ہے، بحری سفر کی بھی بنیاد پڑی اور کشتی سازی شروع ہوئی ۔ انھوں نے نہ صرف سطح آب تک اپنی کوششوں کو محدود رکھا، بلکہ پانی کے اندر کا حال جاننے کی بھی سعی کی ۔ اس کے بعد یونانیوں کے عہد ترقی میں جب اسفنج اور موتی کی جستجو میں غوطہ خوری کا رواج شروع ہوا تو پانی کے حالات بھی کچھ زیادہ معلوم ہوئے یہانتک کہ بحری لڑائیوں میں بھی غوطہ خوری سے کام لیا جانے لگا، چنانچہ پانچ سو سال قبل مسیح جب یونانی بیڑے نے اسپارٹا کا محاصرہ کیا تو غوطہ خور بھی ساتھ ساتھ تھے جو چمڑے کی مشکوں کے سہارے پانی کے نیچے نیچے دور تک چلے جاتے تھے ۔

اسی طرح جب رومی بیڑے نے شہر بازنطین کا محاصرہ کیا تو بازنطین کے غوطہ خوروں نے پانی کے اندر پہونچ کر جہاز کے تختوں میں کیلیں ٹھونک دیں اور بادبانوں کی رسیاں کاٹ دیں ۔ اس طرح جہاز کا رُخ بدل گیا اور وہ سواحل بازنطین تک پہونچگئے جہاں انھیں لوٹ لیا گیا ۔

ارسطاطالیس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "اس وقت کچھ ایسے ذرائع بھی تھے جن سے پانی کے اندر ہوا پہونچ سکتی تھی اور غوطہ خور دیر تک پانی کے اندر رہ سکتے تھے ۔ یعنی جس طرح ہاتھی پانی کے اندر پہونچ کر اپنی سونڈ ہوا لینے کے لئے باہر رکھتا ہے، اسی طرح کے کچھ آلات اس وقت بھی مستعمل تھے ۔

جب عہد وسطیٰ میں یوروپ نے ترقی شروع کی تو بڑے بڑے سمندروں کی طرف توجہ ہوئی جو خطرناک مچھلیوں کی وجہ سے بہت زیادہ غیر محفوظ تھے ۔ اس وقت سمندر کے مہیب و عظیم الشان جانوروں کے متعلق عجیب عجیب روایتیں مشہور تھیں چنانچہ رونڈلے جو ۱۵۵۴ء میں بحریات کا سب سے پہلا ماہر سمجھا جاتا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے کہ :- "ہمارے زمانہ میں ایک انسان کی شکل کا

جانور پکڑا گیا جس کا سر چکنا تھا۔"

اس کے بعد دو صدی تک بحری تحقیقات نے کوئی خاص ترقی نہیں کی اور زیادہ تر واہمہ و قیاس سے کام لیا جاتا رہا چنانچہ ناروے کا ایک ماہر بحریات اپنی ۱۷۵۴ء کی ایک کتاب میں لکھتا ہے کہ :۔ "ہمارے ملاح متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ موسم گرما میں ہم ۲۰ یا ۳۰ بحری میل سے زیادہ سمندر کی گہرائی کا حال نہیں جان سکتے کیونکہ ہمارا وزن جو رسی میں باندھ کر لٹکایا جاتا ہے، سمندر کی تہ تک نہیں پہونچتا اور درمیان میں بڑے بڑے جانور حایل ہو جاتے ہیں جو ایک ایک میل جگہ گھیر لیتے ہیں۔" اس بیان میں یقیناً وہم و قیاس کو زیادہ دخل ہے، لیکن یہ وہم اُنسویں صدی تک اسی طرح باقی رہا۔

اصل سوال یہ تھا کہ سمندر کی گہرائی کتنی ہے اور زیادہ نیچے جاکر جانوروں کا وجود پایا جاتا ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ۱۸۴۸ء میں ایک انگریز ایڈورڈ فوربس نے کچھ علمی طریقے اختیار کئے لیکن وہ ۸۲۰ فٹ سے زیادہ گہرائی کا حال نہ جان سکا، اور نہ ٹھیک طور پر یہ معلوم کر سکا کہ اتنی گہرائی میں کس قسم کے جاندار کا وجود پایا جاتا ہے۔ تاہم وہ اپنی تحقیقات سے اس نتیجہ پر پہونچا کہ ۱۶۴۰ فٹ کے نیچے کسی جاندار کا پایا جانا ناممکن سی بات ہے۔

اس کے بیس سال بعد تک لوگ اسی خیال پر قایم رہے لیکن ۱۸۶۰ء میں جب بحری تار سمندر کی گہرائی میں پھیلائے جانے لگے تو پتہ چلا کہ سات ہزار فٹ کی گہرائی میں بھی آثار حیات پائے جاتے ہیں۔ اور پھر ۱۸۶۸ء میں چودہ ہزار فٹ کی گہرائی میں بھی بعض جاندار حیوانات دیکھنے میں آئے۔

مادرِ وطن کے فلاح و بہبود کے لئے

ہمارے اقدامات

نہایت نفیس، پائدار اور ہم وار

اونی ویونگ یارن

اور

ہنیٹڈ نٹنگ وول

ہمارے ہاں جدید ترین طریقے سے طیار کئے جاتے ہیں۔

گوکل چند رتن چند وولن ملز (پرائیویٹ) لمیٹیڈ (انکار پوریٹڈ ان بمبئی)

کوئنز روڈ امرتسر

باب الاستفسار

احمدی جماعت اور الیاس برنی

(سید نصیر حسین ۔ سہارنپور)

کچھ زمانہ سے آپ احمدی جماعت کی طرفداری میں اظہار خیال کر رہے ہیں اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان سے بہت متاثر ہیں، لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ وہ غیر احمدی مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں ۔ وہ اس حد تک متعصب ہیں کہ عام مسلمانوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی ناجایز سمجھتے ہیں اور ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے وہ اپنے سوا سب کو کافر کہتے ہیں اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اب رہا میرزا غلام احمد صاحب کا دعوائے مہدویت و مسیحیت و نبوت، سو اس کی بابت میں مشورہ دوں گا کہ آپ جناب الیاس برنی کی کتاب "فتنۂ قادیانیت" کا مطالعہ فرمائیے ۔ اس کے پڑھنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میرزا صاحب کے دعوے کتنے لغو و باطل تھے ۔

(نگار) ا۔ اس میں شک نہیں میں احمدی جماعت سے کافی متاثر ہوں اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس وقت ان تمام جماعتوں میں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں، صرف احمدی جماعت ہی ایک ایسی جماعت ہے جس نے صحیح معنی میں اسلام کی حقیقت کو سمجھا ہے ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ کیا ساری دنیا نے اسلام کو چند مخصوص عقاید میں محدود کر دیا ہے اور اس سے ہٹ کر کبھی یہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی کہ اسلام کی ترقی اور مسلمانوں کے عروج کا تعلق صرف عقاید سے نہ تھا بلکہ اطوار و کردار اور حرکت و عمل سے تھا۔ محض یہ عقیدہ کہ "اللہ ایک ہے اور رسول برحق" اپنی جگہ بالکل بے معنی سی بات ہے، اگر اس سے ہماری اجتماعی زندگی متاثر نہیں ہوتی، اسی طرح مخصوص اوقات میں مخصوص انداز سے عبادت کر لینا بھی بے سود ہے اگر وہ ہماری ہیئت اجتماعی پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ تاریخ و عقل دونوں کا فیصلہ یہی ہے ۔ پھر غور کیجئے کہ اس وقت احمدی جماعت کے علاوہ مسلمانوں کی وہ کون سی دوسری جماعت ایسی ہے جو زندگی کے صرف عملی پہلو کو اسلام سمجھتی ہو اور محض عقاید کو مذہب کی بنیاد نہ قرار دیتی ہو۔

میں نے جب سے آنکھ کھولی، مسلمانوں کو باہم دست و گریباں ہی دیکھا۔ سُنّی، شیعی، اہل قرآن، اہل حدیث، دیوبندی، غیر دیوبندی، وہابی، بدعتی اور خدا جانے کتنے ٹکڑے مسلمانوں کے ہو گئے، جن میں سے ہر ایک دوسرے کو کافر کہتا تھا اور کوئی ایک شخص ایسا نہ تھا جس کے مسلمان ہونے پر سب کو اتفاق ہو۔ ایک طرف خود مسلمانوں کے اندر اختلاف و تضاد کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف آریائی و عیسوی جماعتوں کا حملہ اسلامی لٹریچر اور اکابر اسلام پر۔ کہ ۔ اسی زمانہ میں میرزا غلام احمد صاحب سامنے آئے اور انھوں نے تمام اختلافات سے بلند ہو کر دنیا کے سامنے اسلام کا وہ صحیح مفہوم پیش کیا جسے لوگوں نے بھلا دیا تھا یا غلط سمجھا تھا۔ یہاں نہ بوبکر و علی کا جھگڑا تھا نہ رفع یدین و آمین بالجہر کا اختلاف، یہاں نہ عمل بالقرآن کی بحث تھی نہ استشاد بالحدیث کی ۔ اور صرف ایک نظریہ سامنے تھا اور وہ یہ کہ اسلام نام ہے صرف اسوۂ رسول کی پابندی کا، اور اس عملی زندگی کا، اس ایثار و قربانی کا، اس محبت و رافت کا، اس

اخوت وہمدردی کا اور اس حرکت وعمل کا جو رسول اللہ کے کردار کی تنہا خصوصیت اور اسلام کی تنہا اساس وبنیاد تھی۔

میرزا غلام احمد صاحب نے اسلام کی مدافعت کی اور اس وقت کی جب کوئی بڑے سے بڑا عالم دین بھی دشمنوں کے مقابلہ میں آنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا، انھوں نے سوتے ہوئے مسلمانوں کو جگایا، اٹھایا اور چلایا، یہاں تک کہ وہ چل پڑے اور ایسا چل پڑے کہ آج روئے زمین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ان کے نشاتِ قدم سے خالی ہو اور جہاں وہ اسلام کی صحیح تعلیم نہ پیش کررہے ہوں۔

پھر ہوسکتا ہے کہ آپ ان حالات سے متاثر نہ ہوں، لیکن میں تو یہ کہنے اور سمجھنے پر مجبور ہوں کہ یقیناً بہت بڑا انسان تھا وہ جس نے ایسے سخت وقت میں اسلام کی جانبازانہ مدافعت کی اور قرونِ اولیٰ کی اس تعلیم کو زندہ کیا جس کو دُنیا بالکل فراموش کرچکی تھی۔

رہا یہ امر کہ میرزا صاحب نے خود اپنے آپ کو کیا ظاہر کیا۔ سو یہ چنداں قابلِ لحاظ نہیں، کیونکہ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو کیا کہا، بلکہ صرف یہ کہ کیا کیا اور یہ اتنی بڑی بات ہے کہ اس کے پیشِ نظر (قطع نظر روایات واصطلاحات سے) میرزا صاحب کو حق پہونچتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو مہدی کہیں کیونکہ وہ ہدایت یافتہ تھے، مثیل مسیح کہیں کیونکہ وہ روحانی امراض کے معالج تھے اور ظلِ نبی کہیں کیونکہ وہ رسول کے قدم بہ قدم چلتے تھے۔

۲۔ اب رہا یہ امر کہ غیر احمدی لوگوں میں وہ رشتۂ مصاہرت قایم نہیں کرتے اور ان کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے تو اس پر کسی کو کیوں اعتراض ہو۔ کیا آپ کسی ایسے خاندان میں شادی کرنا گوارا کریں گے جس کے افراد آپ کے مسلک کے مخالف ہیں اور کیا آپ ان لوگوں کی اقتدا کریں گے جو اپنے کردار کے لحاظ سے مُقتدا بننے کے اہل نہیں ہیں۔

احمدی جماعت کا ایک خاص اُصولِ زندگی ہے، جس پر ان کے مرد، ان کے بچے اور ان کی عورتیں سب یکساں کاربند ہیں اس لئے اگر وہ کسی غیر احمدی مرد یا عورت سے رشتۂ ازدواج قایم کریں گے تو ان کی اجتماعیت یقیناً اس سے متاثر ہوگی اور وہ یکرنگی وہم آہنگی جو اس جماعت کی خصوصیت خاصہ ہے ختم ہوجائے گی۔ آپ اس کو تعصب کہتے ہیں اور میں اس کو اعتصام وفراست تدبیر رہی برنی صاحب کی کتاب سو اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ جس حد تک بانیِ احمدیت کی زندگی وتعلیم احمدیت کا تعلق ہے وہ تلبیس وکتمانِ حقیقت کے سوا کچھ نہیں۔ اور مجھے سخت افسوس ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ احمدیت کے مخالفین میرزا غلام احمد صاحب سے بہت سی ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو انھوں نے کبھی نہیں کہیں، خصوصیت کے ساتھ مسئلۂ ختم نبوت کہ عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ میرزا صاحب، رسول اللہ کو خاتم النبیین نہیں سمجھتے تھے، حالانکہ وہ شدت سے اس کے قایل تھے کہ شرعی نبوت ہمیشہ کے لئے رسول اللہ پر ختم ہوگئی اور شریعت اسلام دُنیا کی آخری شریعت ہے۔

رعایتی اعلان

من ویزداں ۔ مذہبی استفسارات وجوابات ۔ نگارستان ۔ جمالستان ۔ مکتوبات نیازتین حصے ۔ مذہب ۔ حسن کی عیاریاں

مفت ۸ر ۸ر للعہ ۱۲ر ۵ر ۳ر

فراست الید ۔ مجموعۂ استفسار وجواب جلد سوم ۔ قول فصیل ۔ شہاب کی سرگزشت ۔ نقاب اُٹھ جانے کے بعد

۱ر ۳ر ۲ر ۸ر

میزان = ۴۸ر للعہ

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول صرف چالیس روپیہ میں مل سکتی ہیں۔ نیجر نگار لکھنؤ

ورسٹڈ ویونگ اور ہوزری یارن

کی

ضروریات کی تکمیل کے لئے، یاد رکھئے

حرفِ آخر

"کپور سپن"

KAPUR SPUN.

ہی ہے

تیار کردہ۔ کپور سپننگ ملز۔ ڈاک خانہ رآن اینڈ سلک ملز۔ امرت سر

ادب و تنقید کی معیاری کتابیں

اُردو تنقید پر ایک نظر۔۔۔ (پروفیسر کلیم الدین احمد) ۔۔۔ صہ
سخنہائے گفتنی ۔۔۔۔۔ (" " ") ۔۔۔ صہ
ادب کیا ہے؟ ۔۔۔۔۔ (ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی) ۔۔ ۴؍ ۸؍
ادب کا مقصد ۔۔۔۔۔ (" " ") ۔۔۔ ۳؍
اُردو ادب میں تنقید ۔۔۔ (ڈاکٹر احسن فاروقی) ۔۔۔ ۳؍
قدر و نظر (اختر اورینوی) ۔۔۔۔۔ للعہ
نقش حالی۔ حصہ اول ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صہ
نقش حالی۔ حصہ دوم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳؍
نقوش افکار ۔۔۔۔۔ (مجنوں گورکھپوری) ۔۔۔ ۴؍ ۸؍
ذوق ادب و شعور ۔۔۔۔ (احتشام حسین) ۔۔۔ ۴؍ ۸؍
روایت اور بغاوت ۔۔۔۔ (" ") ۔۔۔ للعہ
تنقیدی جایزے ۔۔۔۔۔ (" ") ۔۔۔ ۴؍ ۸؍
تنقیدی نظریات ۔۔۔۔۔ (" ") ۔۔۔ صہ

ادب و نظر (آل احمد سرور) ۔۔۔۔۔۔۔۔ للعہ
نئے اور پرانے چراغ ۔۔ جدید اڈیشن ۔۔۔۔۔۔۔۔ صہ
مقدمہ شعر و شاعری حالی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶؍
ادبی تنقید ۔۔۔ (ڈاکٹر محمد حسن) ۔۔۔۔۔۔۔۔ للعہ
مطالعہ حالی ۔۔۔ (ناظر کاکوروی و شجاعت علی) ۔۔۔ للعہ
مطالعہ شبلی ۔۔۔ (" " ") ۔۔۔ للعہ
اکبر نامہ ۔۔۔ (عبدالماجد دریابادی) ۔۔۔۔۔۔ ۳؍
امراؤ جان ادا ۔۔۔ (مرزا رسوا) ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳؍
طلسم اسرار ۔۔۔ (" ") ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴؍ ۸؍
فلسفۂ اقبال ۔۔ جدید اڈیشن۔ (عبدالقوی) ۔۔۔ ۴؍ ۸؍
بہار میں اُردو زبان کا ارتقاء۔ (اختر اورینوی) ۔۔۔ صہ
آتشِ گل ۔۔۔ (جگر مرادآبادی) ۔۔۔۔۔۔۔۔ صہ

(چوتھائی قیمت پیشگی آنا ضروری ہے)

منیجر نگار لکھنؤ

سرسید کا ایک دلچسپ طنز

نومبر ۱۸۷۳ء میں بنارس کے کسی مولوی منشی بزرگ نے جن کا نام عبدالحق تھا۔ سرسید کے نام ایک کھلی چٹھی سید الاخبار میں شایع کرائی۔ اس میں بھی وہی سب کچھ لکھا تھا جو اُس وقت عام طور پر سرسید کے خلاف لکھا جاتا تھا۔ اور اسی کے ساتھ دُنیا کو ناپایدار اور ہر دم کو دمِ واپسیں سمجھنے کی بھی تلقین فرمائی تھی۔

اس کے جواب میں سرسید نے ایک طویل خط لکھا، جس میں انھیں بتایا کہ مدرسۃ العلوم کے قیام کا صحیح مقصود کیا ہے، لیکن اس کا وہ حصہ جس میں "ناپایداری دُنیا" پر اظہار خیال کیا ہے، بڑا دلچسپ طنز ہے۔ (نیاز)

آخر کو جو آپ نے نصیحت ناپایداری دُنیا لکھی ہے اور ارقام فرمایا ہے کہ انسان کو لازم ہے کہ ہر دم کو دمِ واپسیں جانے اور اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو، بلاشبہ یہ عمدہ نصیحت ہے مگر یہ ایسی بات ہے کہ اس کو ہر کوئی اعلیٰ و ادنیٰ، عالم و جاہل سب جانتے ہیں مگر افسوس کہ کرتا کوئی نہیں۔ اگر آپ خود ہی اس پر عمل رکھتے ہوتے تو آخر خط میں یہ ارقام نہ فرماتے کہ "نحن منتظرالجواب"، کیوں کہ آپ کو یقین تھا کہ آپ میرا جواب سننے تک زندہ رہیں گے۔ اُس وقت آپ کو اپنی اس نصیحت کا کہ ہر دم کو دمِ واپسیں جاننا چاہئے کیوں خیال نہ رہا؟

مجھ سے آپ سے ملاقات نہیں ہے اور نہ آپ کے حال سے واقف ہوں اس لئے میں نہیں جانتا کہ آپ کس حال میں ہیں مگر میں نہایت ادب اور عاجزی سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے اپنے رہنے کی کبھی کوئی کچی یا پکی حویلی بنوائی ہے، برسات کی تکلیف سے بچنے کے لئے چھپر ڈلوایا ہے؟ آپ کے پاس پہننے کے کپڑے ہیں؟ جن میں سے ایک آدھ تو آپ پہنے ہوئے ہوں گے اور باقیوں کو آیندہ پہننے کے لئے رکھا ہوگا۔ کم سے کم نان بائی یا بھٹیارہ کو صبح شام کی روٹی پکانے کا حکم دیتے ہوں گے اور اس ماہ مبارک رمضان میں سحری کے لئے بھی کچھ اٹھا رکھتے ہوں گے۔ مگر آپ کو اس نصیحت پر کبھی عمل کرنے کا اتفاق نہیں ہوتا کہ شاید "ہمیں نفس نفسِ واپسیں بود"۔ پس جس بات پر کہ آپ کبھی عمل نہیں فرماتے دوسروں کو اس کے کرنے کی کیوں نصیحت فرماتے ہیں؟ جناب ایسی باتیں کہ دینی اور لکھ دینی بہت آسان ہیں مگر اس پر کسی کو عمل کرتے نہیں دیکھا۔

بندہ نے بھی زمانہ دیکھا ہے، بڑے بڑے مقدس عالموں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ بڑے بڑے بزرگوں اور درویشوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں مگر "ابیض نورانی" کا سب کو محتاج پایا۔ پھر بھلا آپ ایسی باتیں جاہل مسلمانوں کے برباد کرنے کی کیوں فرماتے ہیں؟۔ ہمارے دین میں کچھ تنگی نہیں ہے۔ جس سے خدا اور رسول نے منع فرمایا اس سے ہم کو پرہیز کرنا چاہئے۔ جس چیز سے ہم کو منع نہیں کیا وہ ہمارے لئے حلال اور مباح اور خدا کی نعمت ہے ہم کو شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ کی مطابقت میں خدا کی نعمتوں کو لوٹنے دو، برائے خدا آپ کو کیا نقصان ہوتا ہے وہ تو ہمارے خدا کی نعمتیں ہیں، اس نے ہمارے لئے بنائی ہیں۔ پھر ہم نہ لوٹیں گے تو کون لوٹے گا۔ ہاں خدا سے یہ دُعا

مانگو کہ ہم ان نعمتوں کے سبب سے مغرور نہ ہو جائیں اور اپنے خدا کو جس نے وہ نعمتیں ہمارے لئے وقف کر دیں نہ بھول جائیں مروت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کی بھلائی پر کوشش کرے۔ پس آپ بھی اپنے بھائی مسلمانوں کی ترقی کے لئے کوشش کیجئے اور لوگوں سے مدرسۃ العلوم مسلمانان کے لئے للہ چندہ مانگتے پھرئے اور جمع کر کے میرے پاس بھیجتے جایئے۔ حقیقت میں یہ بات، ہر دم کو دم واپسیں سمجھنے پر عمل کرنے کی ہوگی۔ کیونکہ وہ کام اپنے لئے نہ ہوگا بلکہ دوسروں کے لئے ہوگا۔ امید ہے کہ آپ میری اس عرض پر دلی توجہ فرمائیں گے۔

والسلام علی من اتبع الہدی

ادارۂ فروغ اُردو (نقوش) لاہور
کے مطبوعات
اور اس کے خصوصی سالنامے

آپ ہم سے حاصل کر سکتے ہیں، آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جو کتابیں یا سالنامے مطلوب ہوں ان کی قیمت ہمیں بھیج دیجئے۔ پندرہ دن کے اندر آپ کو ذریعہ رجسٹری مل جائیں گی (وی پی کے ذریعہ سے نہیں بھیجی جا سکتیں) آرڈر دس روپیہ سے کم کا نہ ہو، اور محصول بحساب پندرہ فی صدی روانہ کیا جائے۔

منیجر نگار لکھنؤ

سیاست الٰہیہ ..... عہ	سسرال ..... عہ
ہماری داستانیں - صہ	کارٹون ..... ہے
مضامین جمال الدین افغانی صہ	قاضی جی ..... ہے
انتقاد ..... ہے	وغیرہ وغیرہ ..... ہے
امراؤ جان ادا ..... للعہ	اُردو غزل گوئی ..... عہ
خدانخواستہ ..... ہے	عرب کے تین مدبر ..... ہے
کتیا ..... ہے	خالد بن ولید ..... للعہ
بقراط ..... عہ	منٹو نمبر۔ مجلد ..... ہے
جوڑ توڑ ..... للعہ	مکاتیب نمبر ..... عہ
مضامین شوکت ..... عہ	طنز و مزاح نمبر ..... عہ
غزالہ ..... ہے	پطرس نمبر ..... معہ
سودیشی ریل ..... ہے	شخصیات نمبر۔ نمبر ۲۔ مجلد عہ

تاریخ ویدی لٹریچر

نواب سید حکیم احمد

یہ تاریخ اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب آریہ قوم نے اول اول یہاں قدم رکھا اور اُن کی تاریخی و مذہبی کتاب رگوید وجود میں آئی، چنانچہ فاضل مولف نے اپنی کتاب کو اسی عہد سے شروع کیا ہے اور ویدی لٹریچر سے متعلق تاریخی، مذہبی، اخلاقی و روایتی کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو آپ نے نہایت وضاحت و سلاست کے ساتھ پیش نہ کیا ہو۔

بہ سلسلۂ تحقیق انھوں نے مستشرقین مغرب سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔ بھجنوں کے ترجمہ میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا کہ اصل عبارت کا کوئی لفظ ترک نہ ہونے پائے۔ اس کتاب میں جو زبان اختیار کی ہے وہ بہت سلیس اور عام فہم ہے۔

یہ کتاب صرف ویدی ادب بلکہ اس سے پیدا ہونے والے دوسرے مذہبی و تاریخی لٹریچروں کے لحاظ سے بھی اتنی مکمل چیز ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی اور اُردو زبان میں یقیناً یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو خالص موضوع پر اس قدر احتیاط و تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے۔

قیمت چار روپے

منیجر "نگار" لکھنؤ

دوستارے

(نیاز حسین بی۔اے)

میرے خادم نے جبکہ میں اپنی غزل کے پانچویں شعر میں ردوبدل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، کہا "جناب دو فرشتے آپ سے ملنا چاہتے ہیں"۔

——— "کیا انھوں نے تم کو اپنے نام بتائے ہیں"۔ میں نے ذرا بے پروائی سے پوچھا۔

——— "جی ہاں، لیجئے" اس نے دو چھوٹے چھوٹے سفید کارڈ دے کر کہا۔

ایک پر "ہلال" دوسرے پر "بلال" لکھا ہوا تھا۔ اس تحریر سے مجھے یقین ہوگیا کہ بلاشک وہ فرشتے تھے۔

"اچھا ان کو اندر بلا لو"

ایسے انوکھے مہمانوں سے ملتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اپنی بیوی کو جس سے شادی ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا تھا بلانا چاہا تاکہ وہ بھی ان متبرک اور آسمانی ہستیوں سے ملے۔ مگر میں کاغذ اور پنسل میز پر رکھ کر آواز دینے ہی والا تھا، کہ وہ دونوں فرشتے اندر داخل ہوئے۔ وہ سات لمبے لمبے پروں میں لپٹے ہوئے تھے جن میں صبح کے کہرے جیسے ہلکے اور دھنک جیسے ست رنگ جھلک رہے تھے۔ جو کچھ ان کے بدن کا حصہ آنکھ کو نظر آرہا تھا وہ صاف شفاف برف کے ہلکے نیلے ٹکڑے کے مانند تھا، میں نے اپنی کرسی پر سے اُٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا اور ہاتھ کے اشارے سے ان سے بیٹھنے کی التجا کی اور خود بیٹھتے ہوئے ان کی تشریف آوری کی وجہ دریافت کی۔

ہلال نے اپنے پر سکیڑ کر بیٹھتے ہوئے کہا "سولہ برس گزرے، جولائی کی ایک پر لطف رات میں ہم آسمان کے زرد فرش پر چوگان کھیل رہے تھے" "معاف کیجئے" میں نے ایک دم کہا "میں خیال کرتا تھا کہ آسمان نیلا ہے" "کچھ حصوں میں بہت اونچائی پر نیلا ہے، مگر کچھ حصوں میں جہاں وہ فارس کے شہروں اور گاؤں پر ہے وہ زرد ہے جو آنکھ کو خوب بھاتا ہے"۔ ہلال نے کہا۔

دوسرا فرشتہ اپنے خوبصورت پر سکیڑے نہایت خاموشی سے آنکھیں نیچی کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طرح کا حسین غم جھلک رہا تھا اور جس کو دیکھ کر مجھے تکلیف ہوئی۔

"ہماری گیندیں دو چمکتے ہوئے حسین ستارے تھے" ہلال نے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ذرا زور سے کہا۔

"کھیلنے کی لکڑیوں کے لئے" میں نے پوچھا۔

"دُمدار ستاروں کی دُمیں، کھیل بہت دلچسپ تھا، میں بازی جیتنے ہی والا تھا کہ ایک سخت چوٹ سے میں نے دونوں گیندوں کو حد سے باہر پھینکدیا"۔

"حد سے باہر"

"جی، افق کی حد سے باہر، بڑی مصیبت کا سامنا ہوا، آپ خیال کرسکتے ہیں کہ آسمان پر دو ستاروں کا کم ہوجانا معمولی

بات نہیں۔ ہم کو حاکمانِ فلک سے حکم ملا کہ جب تک دونوں کھوئے ہوئے ستارے اپنی اپنی جگہ پر واپس نہ کر دئے جاویں گے ہم کو بہشت میں داخل ہو کر لطف اُٹھانے کی اجازت نہ ملے گی۔

آپ ہماری سولہ سال کی کوشش کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے زمین اور آسمان کا ایک ایک کونہ جہاں ستارے گر سکتے ہیں ڈھونڈ ڈالا، مگر افسوس ہماری کوشش کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

"ہم ہمیشہ کے لئے جلاوطنی اختیار کرنے والے تھے کہ ہم نے آپ کی محبوبہ کی آنکھوں کا ذکر سنا کہ بجائے دو انسانی آنکھوں کے ان کے پاس وہ کھوئے ہوئے ستارے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ ان کو واپس کر دیں گی۔"

مجھے یہ سُن کر سخت حیرت ہوئی اور یہ معلوم کر کے کہ یہ دونوں معصوم فرشتے میری بیوی کی بے نظیر آنکھوں کے طلب گار ہیں تکلیف بھی ہوئی۔ لیکن ان کی غمزدہ صورتیں اور ان کی سولہ سال کی داستان مصیبت سُن کر رحم بھی آیا اور ان کی کھوئی ہوئی چیز کو جس کا مل جانا میری طاقت میں تھا واپس کر دینے کا ارادہ کر کے اپنی پیاری محبوبہ کو آواز دی۔

وہ بے تکلف ننگے سر اپنے لمبے لمبے بال کھولے ہوئے یہ سمجھ کر کہ میں اکیلا ہوں آگئی دو نامحرموں کو دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنی نیلے رنگ کی ساری کا پلّو اپنے سر پر کر لیا اور میری برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کی آنکھوں کو میں نے دیکھا اور پھر اس کو اندھا تصور کیا۔ ایک تکلیف دہ کپکپی میرے بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے چند لفظوں میں اسے کل حال بتا دیا۔

میری توقع کے برخلاف نہ اسے تکلیف ہوئی نہ رنج۔ وہ بالکل خاموش رہی اور چند منٹ ساکت رہنے اور غور کرنے کے بعد وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد کہا "حسین فرشتو! دیکھو کہ کیا میری آنکھیں تمہارے کھوئے ہوئے ستارے ہیں؟"

وہ آگے بڑھے، انھوں نے اس کی دونوں شفاف آنکھوں کو غور سے دیکھا، کچھ دیر تک وہ آپس میں عجیب حرکتوں سے تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ پھر ہلال نے کہا "یہ وہ چمک دار تارے نہیں ہیں جو سولہ برس ہوئے کھوئے گئے تھے۔ ہمارے تارے حالانکہ چمک میں سب تاروں سے زیادہ تھے مگر اتنے چمکدار نہ تھے۔"

اس کے بعد وہ بہت پژمردگی کے ساتھ واپس ہو گئے۔ مجھے ان کی حالت پر سخت رحم آیا حالانکہ میں خوش تھا کہ انھوں نے میری معشوقہ کی ان دونوں قیمتی آنکھوں کو چھوڑ دیا تھا۔

اور وہ؟ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "کیا میں نے ان دونوں کو چکمہ نہیں دیا" کیا "یہ سچ ہے ..... میری ماں نے مجھے بارہا بتایا کہ میری پیدائش کے کچھ دنوں بعد دو ستارے کھڑکی میں ہو کر ٹھیک میری آنکھوں پر گرے تھے۔ غالباً وہ یہی دیکھ رہے تھے اور میں اس وقت کا خیال کرنے لگی جب تم نے پہلی مرتبہ اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے میرے لبوں کو بوسہ دیا تھا، مجھے وہ دن یاد تھا اور اس کی یاد نے میری آنکھوں کو ان آسمانی ستاروں سے زیادہ چمکدار اور خوبصورت بنا دیا۔"

میں نے اسے پکڑ کر پھر اظہار محبت کرنا چاہا مگر وہ یہ کہتی ہوئی کہ میں نے ابھی غسل نہیں کیا، اندر بھاگ گئی اور میں پھر اپنے پانچویں شعر کی اصلاح میں مشغول ہو گیا۔

(فرانسیسی)

مرثیہ نگاری و میر انیس

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا بے لاگ تبصرہ انیس کے فن مرثیہ نگاری پر۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)۔ منیجر نگار لکھنؤ

"جامِ کہن ——— اور ——— بادۂ نو"

(اکبر حیدری)

بہلاؤں تا بہ کے دلِ آشفتہ سر کو میں — کب تک مٹاؤں رنج و الم کے اثر کو میں
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں — شاید کچھ اس طرح میری تسکین ہو سکے
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

حرماں نصیب دل کی تسلی کو کیا کروں — کب تک میں بزمِ ناز سے ناآشنا رہوں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — لیکن یہ سادگی ہے کہ از راہ امتحاں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

بے اختیاریوں پہ نہیں کوئی اختیار — اللہ رے اضطراب دلِ ناتوان و زار
جانا پڑا رقیب کے در تک ہزار بار، — اور ایسے حال میں کہ نہیں طاقت و سکوں
اے کاش جانتا نہ ترے رہگذر کو میں

باطل کی شوخیوں سے نہ حق آشنا ڈرے — اک سرفروشِ قتل کی دھمکی سے کیا ڈرے
ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے — سمجھا ہے تم نے کیا مرے دہم و قیاس کو
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

اب دورِ عاشقی کا زمانہ تمام ہے، — کہتے ہیں جس کو عشق وہ سودائے خام ہے
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے — اللہ رے زرپرستیٔ دنیائے حسن و ناز
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں،

پروانہ جیسے جاتا ہے شعلہ کی لَو کے ساتھ — تاریکیوں کا دور چلے جیسے ضو کے ساتھ
چلتا ہوں تھوڑی ہر اک راہ رو کے ساتھ — صرف اس امید پر کہ ملے کوئی غمگسار
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کم بخت جانتا ہی نہیں عشق کا وقار — اہلِ ہوس سمجھ نہ سکیں گے مرا شعار
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — یہ کم نگاہیاں تھیں کہ کہنا پڑا مجھے
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

اب لغزشِ قدم پہ نہیں کوئی اختیار — جذبات ہوشیار، نہ احساس پائدار
پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار — اے وائے فرطِ شوق کی حرماں نصیبیاں،
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

ملتا نہیں کوئی مجھے مجھ جیسا مبتلا، — اہلِ نظر کو ڈھونڈھتا پھرتا ہوں جا بجا
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — میرا قصور ہے کہ بہ عنوانِ شاعری
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

جویا اس آستاں کا ہے اکبر سرِ نیاز — محمود سے جدا رہے کب تک بھلا ایاز
غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز — ضیغم حیدری کو نمایاں کئے ہوئے
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

(ارشد کاکوی ڈھاکہ)

اپنا جینا بھی حقیقت ہے نہ جینا بھی بجا — کون مانے گا اسے ہم نہ مرے اور نہ جئے
جس کی کرنوں سے ہے محروم مرا غم خانہ — ہم سے اُس چاند کی خاطر کئی خورشید چھٹے
بادہ نوشی کا نہیں کچھ بھی جواز اس کے سوا — میکدہ راہ میں آیا تھا حرم سے پہلے
چاند کو دیکھ کر پھول کو سونگھ کر — کون ہے جو سدا صرف ہنستا رہے
اللہ اللہ یہ زیست سامانیاں — چند وعدے، بھروسے، امیدیں، گِلے
پھول کی وادیاں اور تنہا سفر، — کوئی انگاروں پر جیسے ارشد چلے

(سعادت نظیر)

راہِ غم میں قدم قدم پہ مجھے — سیکڑوں کارواں ملے دل کے
کس قدر صبر آزما ہیں! نظیر! — توبہ! توبہ! معاملے دل کے!
جنونِ شوق میں جب بھی تلاش منزل کی — تو خار کی بھی خلش خوش گوار گزری ہے

(جاوید - حیدرآبادی)

اب خزاں پر نہ بہاراں پہ ہنسی آتی ہے — فکرِ اربابِ گلستاں پہ ہنسی آتی ہے
سب اُڑاتے ہیں ہنسی میرے سیہ خانے کی — اور مجھے بزمِ چراغاں پہ ہنسی آتی ہے
نگاہِ ساقیِ میخانہ عام ہو کہ نہ ہو — بہار آئے گی کچھ اہتمام ہو کہ نہ ہو
تو نغمہ ہائے مسرت ہی گائے جا مطرب — تسلسلِ غمِ ہستی تمام ہو کہ نہ ہو
غمِ دنیا غمِ دل اور غمِ جاں کچھ بھی نہیں — غم اُٹھانا ہی جو ٹھہرا تو گراں کچھ بھی نہیں
یوں تو ہر شے سے عیاں جلوے ہیں اسکے جاوید
لیکن اس طرح عیاں ہیں کہ عیاں کچھ بھی نہیں

(طالب جے پوری)

یاد پھر آنے لگا رہ رہ کے کچھ کھویا ہوا — اے جنوں ہوش کس عالم میں لے آیا مجھے
بیٹھے بیٹھے خود بخود آنکھوں میں آنسو آگئے — آج اے طالب نہ جانے یاد کیا آیا مجھے
فضا خاموش، ساکت بام و در، تنہائی کا عالم — تجھے بھی ساز دل ایسے ہی میں تھا بے صدا ہونا
یہ ہو سکتا ہے دل مایوس ہو جائے محبت میں — بہت مشکل ہے طالب بے نیازِ مدعا ہونا

(متین نیازی)

خاموش سہے جائیں گے ہم جورِ مسلسل — ارباب ستم بھی ہمیں کیا یاد کریں گے

کس طرح بتائیں ہم تم کو انسان کا دل کیوں رقتا ہے — بیگانۂ غم ہو کیا جانو، ہونے بھی دو جو کچھ ہوتا ہے

ہم ایسے آرزو سے باز آئے — وہ آئیں اور آنکھیں دیکھا نہ جائے

کہیں ایسا نہ ہو طوفاں سے بچ کر — کنارے پر سفینہ ڈوب جائے

بدر جمالی

موت کی منزل سمجھتے تھے کہیں ہو گی قریب — زندگی کے ساتھ لیکن دور جانا ہی پڑا

کیا مرحلے ہیں عشق میں سوز و گداز کے — شمعیں پگھل گئیں کہیں پروانے جل گئے

زمانہ ہو گیا اُجڑے ہوئے اپنے نشیمن کو — لئے پھرتا ہوں گلشن میں، غرورِ آشیاں اب تک

رُباعیات

شفیق مینائی

جنس کا سد پہ سر دُھنے گا کب تک — طعنے اغیار کے سُنے گا کب تک

لا ڈھونڈ کے گوہر تہہ دریا سے شفیق — ساحل کے خزف پارے چُنے گا کب تک

اے ذوقِ طلب کچھ ترا انعام تو ہے — اک مشغلہ جاری سحر و شام تو ہے

اس میکدۂ تہی میں یہ بھی ہے بہت — رندوں کے لئے دُردِ تہِ جام تو ہے

دل وقفِ عذاب ناصبوری ہو جائے — اک خواب یہ عالمِ حضوری ہو جائے

اس قرب سے تسکین ہو کیونکر اے دوست — جس قُرب کے بعد اور دوری ہو جائے

دل کو غم سے نجات مل جاتی ہے — نظروں کو نئی حیات مل جاتی ہے

تم چھپتے ہو چھپ جاتا ہے ہر نقشِ وجود — تم ملتے ہو کائنات مل جاتی ہے

مطبوعات موصولہ

اُڑان مجموعہ ہے جناب مجید شاہد کی غزلوں کا۔ شاہد صاحب اصناف سخن میں صرف صنف غزل کے قایل ہیں اور اسی رجحان کے زیر اثر انھوں نے تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء سے غزلیں کہنا شروع کیں۔ یہ مجموعہ انھیں غزلوں کا انتخاب ہے۔ شاہد صاحب باوجود روایتی ٹکنک کے غزل میں روایتی شاعری کے قایل نہیں اور پامال تشبیہات و استعارات استعمال کرنا پسند نہیں کرتے، وہ ہر بات صاف صاف کہتے ہیں خواہ وہ عشق و جنوں کی ہو یا ہوش و خرد کی اور یہی ان کی شاعری کی انفرادیت ہے یہ دیوان ردیف وار مرتب کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے تقیل ردیف و قوافی کی بھی پروا نہیں کی، لیکن با اینہمہ وہ تغزل سے کہیں نہیں ہٹے۔

کسی شاعر کے کلام کو بالاستیعاب دیکھنے کی فرصت مجھے بہت کم ملتی ہے اس لئے میں اس کا مطالعہ تمام و کمال تو نہیں کر سکا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جہاں جہاں جس شعر پر نظر پڑی میرے دل نے بھی اس کا ساتھ دیا اور دیر تک اس سے لطف حاصل کرتا رہا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ شاہد صاحب کے کلام میں جان بھی ہے اور شان بھی۔ اور یہ امتزاج بہت کم کہیں نظر آتا ہے قیمت ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ گوشۂ ادب۔ انارکلی۔ لاہور۔

مقام حسین سیرت حسین اور واقعۂ کربلا پر جناب پیام شاہجہاں پوری کی یہ کتاب مجھے بہت پسند آئی، نہ صرف اسلوب بیان کے لحاظ سے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ اس میں واقعات و حالات کی تحقیق کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور بڑی حد تک صحیح مورخانہ فرض ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس میں بعض مشہور واقعات کربلا کی بھی تنقیح کی گئی ہے، لیکن جو تفصیل انھوں نے دست بدست جنگ اور یلغار کی دی ہے، اس کے ماننے میں مجھے تامل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعہ گھنٹے دو گھنٹے سے زیادہ کا نہ تھا اور یہ ممکن نہ تھا کہ جنگ کی تمام تفصیل کو کوئی شخص یاد رکھ سکتا۔

کتاب بہت دلچسپ ہے اور بڑے اہتمام سے اشاعت منزل بل روڈ لاہور نے شایع کی ہے۔ قیمت چھ روپیہ۔ ضخامت ۳۹۴ صفحات۔

حدیث خودی جناب شام موہن لال جگر بریلوی کی آپ بیتی ہے، جو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ایک فنی مقالہ سے شروع ہوتی ہے۔ جگر بریلوی اس عہد کے انسان ہیں، جب زندگی نام تھا صرف چین سے رہنے اور دوسروں کو چین سے رہنے دینے کا اس سے زیادہ چنیں چناں کرنے والوں کو کچھ اور سمجھا جاتا تھا) جگر کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی اور اسی ماحول کو وہ اپنی شاعری میں بھی لے گئے، سادگی، خلوص، لطف و رافت کی فضا میں وہ پروان چڑھے اور یہی ان کی وضع ہو گئی، جسے وہ آج تک نبھا رہے ہیں، یہاں تک کہ ان کی شاعری بھی ان کی اسی فطرت کا آئینہ ہے۔

انھوں نے جس سادگی سے اپنے حالات لکھے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے مبارک زمانہ میں پیدا ہوئے، کتنا اچھا ماحول انھیں ملا اور کتنی اچھی تربیت ذہن و فکر انھیں میسر آئی۔ دنیا انھیں صرف ایک اچھا شاعر جانتی ہے، لیکن اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اچھے انسان بھی ہیں۔ اتنے اچھے کہ اس زمانہ میں اس کا تصور بھی گویا محض تصور خواب ہے۔ خدا انھیں زندہ و سلامت رکھے۔

اس کتاب کا نام حدیثِ خودی البتہ مناسب نہیں۔ خود اور خودی میں فرق ہے۔ آپ بیتی کتنا اچھا، صاف و سادہ نام تھا

لیکن اس طرف نگاہ نہیں گئی۔ یہ کتاب دبستانِ اُردو امرت سر سے دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔

رابعۂ بصری ترجمہ ہے سیدہ وداد انسکا کینی کی کتاب کا جس میں دنیائے تصوف کی مشہور ہستی رابعۂ بصری کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔

یونتو رابعۂ بصری کے نام سے ہر شخص واقف ہے، اُردو ادب میں بھی اس نام کو تلمیحی حیثیت حاصل ہے، لیکن ان کے حالات کا علم ہزار میں سے ایک کو بھی نہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب صنف تاریخ و تذکرہ میں بڑا اچھا اضافہ ہے اور مکتبۂ جدید لاہور نے اسے شایع کرکے ادب کی بڑی اچھی خدمت انجام دی ہے۔

اس کے مترجم جناب صارم الازہری ہیں اور ترجمہ بہت سلیس و شگفتہ ہے۔ قیمت عہ

اُردو کریما۔ رحیما شیخ سعدی شیرازی کی مشہور فارسی نظم کریما کا ترجمہ ہے، اُردو نظم میں جسے جناب صبر رضوی مخدوم نے بڑے سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اخیر میں انھوں نے اپنی بھی ایک نظم اسی انداز سے رحیما کے نام سے اس میں شامل کردی ہے۔ یہ کتاب یکسر تعلیم اخلاق سے تعلق رکھتی ہے اور مناسب ہو اگر بچوں کے نصاب میں اس کو شامل کردیا جائے۔ قیمت ۱۰ر۔ ملنے کا پتہ:۔ نسیم احمد صاحب۔ شیخ پورہ (مونگیر)

آتش خنداں مرزا نظام شاہ لبیب تیموری کے کلام کا مجموعہ ہے جسے جناب عرش تیموری نے مرتب کیا ہے۔ مرحوم بہادر شاہ ظفر کے پرپوتے تھے، اوایل عمر ہی میں اپنے والد مرزا خاور کے ساتھ حیدر آباد چلے گئے اور وہیں ساری عمر بسر کی مرحوم بڑے ذی علم انسان تھے اور شعر گوئی کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اس مجموعہ میں ان کی نظمیں، غزلیں، گیت وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں اور ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مفکر قسم کے شاعر تھے اور محض بیان حسن و عشق ان کی شاعری کا مقصود نہ تھا۔

یہ مجموعہ بڑی تقطیع پر خاص اہتمام سے شایع کیا گیا ہے اور جناب عرش تیموری سے دفتر روزنامہ جنگ لاہور کے پتہ پر مل سکتا ہے۔ قیمت چھ روپیہ۔ ضخامت ۳۲۴ صفحات۔

نیا انسان منظوم ڈراما ہے جناب فضل الرحمان صاحب کا لکھا ہوا جسے مکتبۂ صبا حیدر آباد نے شایع کیا ہے۔ اس کے مصنف دکن کے مشہور ڈرامہ نگار ہیں اور ان کے لکھے ہوئے متعدد ڈرامے اسٹیج پر آچکے ہیں۔

اسٹیج کے لئے منظوم ڈرامہ اب زیادہ مقبول نہیں، لیکن شاعرانہ اہمیت اس کی ہمیشہ تسلیم کی جائے گی۔

اس ڈرامہ کے کردار آدم، حوّا، فرشتے، شیطان اور ہاتف ہیں اور منظر وہ ہے جب آدم و حوّا جنت سے نکل کر ہزاروں سال کے بعد پھر فردوس واپس آئے اور فرشتوں سے ہمکلام ہیں۔

خیال اور زبان دونوں حیثیتوں سے یہ ڈرامہ قابل تعریف ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ صبا حیدر آباد۔

پھول، کلیاں مختصر سا مجموعہ ہے جناب سعادت نظیر حیدر آبادی کی ان نظموں کا جو انھوں نے خصوصیت کے ساتھ طلبہ کے لئے لکھی ہیں، اور لفظی و معنوی دونوں طرح پیام محبت اور درس وفا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ زبان صاف و شگفتہ، خیال پاکیزہ اور اسلوب بیان ولولہ خیز ہے۔

یہ مجموعہ ۶۰ نئے پیسے میں سلطان شاہی حیدر آباد (۲) کے پتہ پر سعادت نظیر صاحب سے مل سکتی ہے۔

نوید گل یہ رسالہ بھی سعادت نظیر کی بعض ان نظموں کا مجموعہ ہے جن میں بعض معاشی، ثقافتی و سیاسی مسایل پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور باوجود کلاسکل لب و لہجہ کے "عصر حاضر" کا بھی ترجمان ہے۔

قیمت ۲۰ نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ: سلطان شاہی حیدر آباد۔

کلام بے لگام - مجموعہ ہے جناب این۔ بی۔ سین، ناشاد کے مزاحیہ و طنزیہ کلام کا جو زیادہ تر چھوٹے چھوٹے قطعات پر مشتمل ہے۔ جناب ناشاد اظہار جذبات پر اچھی خاصی قدرت رکھتے ہیں، اس لئے اپنے مخصوص رنگ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ "بے لگام" چاہے کتنا ہی ہو، لیکن مہمل نہیں۔

اس میں جا بجا تصویریں بھی نظر آتی ہیں جو بڑی حد تک سوقیانہ قسم کی ہیں۔ اس لئے یہ نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔

یہ مجموعہ نیو بک سوسائٹی آف انڈیا پوسٹ بکس ۲۵۰ - نئی دہلی نے شایع کیا ہے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت چھ روپیہ جو بہت زیادہ ہے۔

فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی - یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں میں ایک صاحب اکرام علی بھی تھے اور اپنے معاصرین (سید حیدر بخش حیدری، میر امن دہلوی، مرزا علی لطف، میر شیر علی افسوس وغیرہ) میں خاص درجہ امتیاز رکھتے تھے۔

یہ کتاب صرف اکرام علی ہی کے حالات پر مشتمل نہیں بلکہ اس کے مولف جناب نادم سیتاپوری نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس عہد کی پوری ادبی تاریخ قلمبند کر دی ہے جس میں فورٹ ولیم کالج کی علمی خدمات اور ڈاکٹر گلکرائسٹ کی ادب نوازیاں بھی شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ جناب نادم نے اکرام علی کے تمام معاصرین کا حال بھی اس سلسلہ میں قلمبند کر دیا ہے اور اسی کے ساتھ اخوان الصفا پر بھی روشنی ڈالی ہے جو چوتھی صدی ہجری کی مشہور علم دوست جماعت تھی۔

جناب نادم کی یہ تالیف دراصل تذکرہ ہے اس عہد کے ادیبوں اور شاعروں کا جن میں سے بعض کے نام سے تو ہم واقف ہیں لیکن ان کے حالات کا علم نہیں رکھتے۔ اکرام علی کے حالات تو ان کو تفصیل سے لکھنا ہی تھے کیونکہ یہ ان کے ہموطن تھے، لیکن اکرام علی کے معاصرین کے حالات بھی انھوں نے کافی شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں اور اس طرح سے کتاب نے ایک بڑے اچھے تذکرہ کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ فاضل مولف نے اس کتاب کی ترتیب میں جس کاوش و محنت سے کام لیا ہے اس کا صحیح اندازہ اس کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

ضخامت ۳۰۲ صفحات۔ قیمت چار روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ۔

نگار کے بعض مکمل و نامکمل "فایل"

سنہ ۴۲ء = مکمل فایل (مع انتقاد نمبر) عنہ ۲۰ء علاوہ محصول

سنہ ۴۷ء = مکمل فایل (مع ماجد و لین نمبر) عنہ ۲۰ء "

سنہ ۵۲ء = مکمل فایل (مع حسرت نمبر) صہ ۱۵ء "

سنہ ۵۳ء = مکمل فایل (مع داغ نمبر) عنہ ۲۰ء "

سنہ ۵۵ء = مکمل فایل (مع علوم اسلامی نمبر) صہ ۱۵ء "

سنہ ۵۷ء = مکمل فایل (مع اصناف سخن نمبر) صہ ۱۵ء "

سنہ ۵۸ء = مکمل فایل (مع معلومات نمبر) صہ ۱۵ء علاوہ محصول

سنہ ۵۹ء = مکمل فایل (مع تنقیح اسلام نمبر) صہ ۱۵ء "

سنہ ۳۲ء = جولائی تا دسمبر عنہ ۱۰ء "

سنہ ۳۷ء = جنوری تا جون (مع ڈرامہ اصحاب کہف) عنہ ۱۰ء

نصف قیمت پیشگی بھیجنا ضروری ہے

منیجر نگار لکھنؤ